لسہ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

الحق

اکوڑہ خٹک

فون نمبر۔ دارالعلوم ۴
فون نمبر۔ رہائش ۲

★

جلد نمبر ۷
شمارہ نمبر ۱۱، ۱۲

★

رجب / شعبان ۱۳۹۲ھ
اگست / ستمبر ۱۹۷۲ء

★

مدیر : سمیع الحق

—— مقامِ اشاعت ——

دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

—— طابع ——

منظور عام پریس پشاور

—— پرنٹر ——

محمد شریف

—— ناشر ——

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ

—— کتابت ——

احمد حسن

—— بدلِ اشتراک ——

سالانہ .... ۸ روپے
فی پرچہ .... ۷۵ پیسے
سالانہ غیر ممالک بحری ڈاک : ایک پونڈ
سالانہ غیر ممالک ہوائی ڈاک : [illegible]

پیشِ نظر پرچہ اگست اور ستمبر کا مشترکہ شمارہ ہے اور اسی پہ ساتویں جلد ختم ہوتی ہے۔ ہمیں نہایت افسوس ہے کہ پچھلے کئی ماہ سے الحق کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے اور معزز قارئین کو کافی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کتابت طباعت کاغذ کی مشکلات اور گوناگوں عوارض کے باوجود ہم اشاعت کو معمول پر لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ اور اسی کی ایک کڑی پیشِ نظر شمارہ کے صفحات بڑھا کر یکجا شائع کرنا ہے تاکہ الحق کے اگلے سال کے نئے شمارہ (اکتوبر) کو ہم بفضلِ خدا بروقت شائع کر سکیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین سابقہ مجبوری پیش نظر اس تاخیر اور بے ترتیبی پر معذرت قبول فرمائیں گے۔ (ادارہ)

اس شمارے میں

نقشِ آغاز ــــ شیعہ نصاب کی علٰحدگی کا مسئلہ	سمیع الحق	۷
قومی اسمبلی میں ــــ معاہدہ شملہ پر تقریر	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب	۱۵
دستوری ترمیم پر تقریر	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب	۲۵
شیعہ نصاب کی تحریک التواء	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب	۱۹
تعطیلِ جمعہ کی قرار داد	شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب	۲۴
ربوہ میں کیا ہو رہا ہے۔؟	صدر ادارہ الفاروق ربوہ	۲۷
میری علمی اور مطالعاتی زندگی	مولانا محمد ابراہیم جان (ستور بازار) کابل	۳۱
سیرت نبویؐ اور مستشرقین	علامہ شمس الحق افغانی	۳۸
عربی کو لازمی قرار دیجئے	ڈاکٹر سید محمد یوسف۔ کراچی	۴۶
حکومتِ سرحد کی خدمت میں	قارئین	۴۹
انسان حیوانیت کے گڑھے میں	ریاض الحسن نوری۔ ایم۔ اے	۵۴
سید شریف جرجانی اور تفتازانی	مولانا لطافت الرحمٰن سواتی۔	۶۰
سقوطِ مشرقی پاکستان	مولانا محمد منظور نعمانی۔ لکھنؤ۔	۶۶
کیا غلطی تسلیم کرنے کی ہم میں جرأت ہے۔؟	شاہد رام نگری نقیب (انڈیا)	۷۱
کچھ تلافیٔ مافات	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب	۷۴
مدینہ منوّرہ کی اسلامی ریاست	نور محمد غفاری۔ ایم۔ اے	۷۷
افکار و تاثرات	قارئین	۸۲
مشاہیر علمائے سرحد (مولانا عبدالشکور)	قاری فیوض الرحمان	۸۶
تبصرۂ کتب	اختر راہی۔ ایم۔ اے	۸۸

★ ★ ★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

شیعہ نصاب کی علیحدگی کا مسئلہ

اخبارات میں شیعہ نصابِ دینیات کی علیحدگی کے سلسلہ میں صدرِ پاکستان اور دیگر اربابِ اختیار کی یقین دہانی آچکی ہے، اور یہ بھی کہ نئے سال کے آغاز سے نئے نصاب کو جاری کر دیا جائے گا۔ مزید یہ کہ تاریخِ اسلام کو نئے سرے سے مرتب کر کے شاملِ نصاب کیا جائے گا۔ پاکستان کی ۹۰، ۹۵ فیصد آبادی اہلِ سنت والجماعۃ کی اکثریت اور مسلمانوں کی سوادِ اعظم اور اہلِ علم اور صاحبِ فکر طبقے اس فیصلہ کے ہولناک نتائج کو دیکھتے ہوئے جتنے بھی پریشان ہوں، تو بجا ہوگا۔

ہم آج کی صحبت میں اس فیصلہ کے بعض دوررس اور خطرناک نتائج پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ مقصد ملک کی سالمیت اور ملی یکجہتی رہے۔ اور تمنا ملک کی گاڑی کو اس مہلک راہ سے بچانے کی ہے جس پر اس ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ کی صورت میں ملک کو ڈالا جا رہا ہے۔

ملک کے سیاسی تقاضوں، اقتصادی ضرورتوں اور سوادِ اعظم کی دینی اور معتقداتی نزاکتوں کے لحاظ سے حکومت کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ایسے اہم مسئلہ پر عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے اکثریتی طبقہ سنی مسلمانوں کو اعتماد میں لے اور ان کے معتمد علماء اور اربابِ فکر سے مشورہ کرے۔

... سیاسی لحاظ سے ملک کو اس وقت جس فکری سلامتی، اتحاد اور قومی یکجہتی اور نظریاتی یگانگت کی ضرورت ہے اتنی کبھی نہ تھی ملی اتحاد پر آئندہ رہے سہے ملک کی بقاء کا دارو مدار ہے۔ اب تک خوش قسمتی سے شیعہ سنی طبقوں میں یہ فضا قائم رہی باہمی منافرت اور اجنبیت کا احساس یا شدتِ احساس کم ہی رہا۔ سنی مسلمانوں نے تو تحریکِ پاکستان کے آغاز سے لیکر اب تک اس سلسلہ میں نہایت فراخدلی اور رواداری کا مظاہرہ کیا اور بارہا اپنی قسمت کی باگ ڈور بھی ایسے ہاتھوں میں دیکر مضائقہ محسوس نہ کیا۔ جن ہاتھوں نے آگے چل کر ملتِ مسلمہ کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہ اٹھائی اور بالآخر مسلمانوں کے اس حصارِ پاکستان کو پاش پاش کر کے ہی چھوڑا ۔۔۔۔ بہرحال اس باہمی رواداری اور حسنِ معاشرت میں بنیادی عامل موجودہ متحدہ دینی نصاب ہی رہا کہ سکول اور تعلیم گاہ کے ماحول میں بچوں کے اذہان ایک دوسرے سے علیحدگی اور جداگانہ گروہی وجود کی تربیت سے محفوظ رہے۔ اور اس بات کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بحمد اللہ کہ قیامِ پاکستان

کے بعد ہمارے تعلیمی ادارے ، شیعہ سنی نظریاتی تصادم کی لپیٹ میں نہیں آئے۔ اور نہ اکثریتی فرقہ کی دینیات شیعہ بچوں کے جذبات مجروح کرنے کا ذریعہ بنی۔ تعلیمی اداروں سے باہر بھی ہماری زندگی اس کھچاؤ سے کافی حد تک محفوظ رہی۔ بلکہ تعلیمی نصاب اور نظام کی یگانگت کافی حد تک بچوں کے ناپختہ اذہان میں باہمی الفت و تعلق اور نظریاتی اعتدال پیدا کرنے کا موجب بنتی رہی۔

اب جب نصاب کی علیحدگی کی صورت میں بچپن ہی سے بچوں کے اذہان میں ان کے جداگانہ خیالات اور نظریات اور علیحدہ علیحدہ حیثیت کا شعور اجاگر کیا جائے گا۔ تو یہ احساسِ علیحدگی آگے چل کر باہمی منافرت کی کتنی خطرناک شکل اختیار کر سکے گا اور قومی یکجہتی اور فکری یگانگت کس بے دردی سے انتشار و افتراق میں بدل جائے گی۔

۲۔ پھر یہ دیکھئے کہ علیحدگی کا یہ سلسلہ آخر کہیں جا کر رک بھی سکے گا یا نہیں۔؟ اس ملک میں دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والی کئی غیر مسلم اقلیتیں موجود ہیں جو شیعہ حضرات کے اپنے مطالبات کے حق میں دئے گئے دلائل سے زیادہ وزنی دلائل کے ساتھ ایسے مطالبات کر سکتے ہیں۔ پھر کیا ہمیں ان مٹھی بھر اقلیتوں، ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی، بدھسٹ، بہائی یا قادیانی (کہ مسلمان انہیں بہرحال اقلیتی غیر مسلم فرقہ سمجھتے ہیں) فرقوں کے لئے بھی ایک الگ الگ نصاب رکھنا ہوگا۔ اور ہر فرقہ کی خواہش پر نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کی از سر نو تنظیم کرنا ہوگی۔ ایک نہایت نامعقول رسم ڈالنے کے بعد ہم ایسے مطالبات کو کس طرح ناقابلِ تسلیم اور نامعقول کہہ کر مسترد کر سکیں گے۔ اتحاد کی رسی ہاتھ سے چھوٹ جانے کے بعد ملک و ملت کی شیرازہ بندی کس بنیاد پر ممکن ہو سکے گی۔

۳۔ شیعہ حضرات اگر اس طرح اپنا ایک علیحدہ تشخص قائم کرنے پر مصر ہیں تو یہ بنیادی سوال اٹھ سکتا ہے کہ کیا وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے ایک جداگانہ قومیت تصور کرتے ہیں۔؟ جہاں تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا تعلق ہے اسکی طرف سے ایسی کوئی آواز شیعوں کی علیحدگی کی نہیں اٹھائی گئی نہ وہ انہیں مسلمانوں سے ایک الگ غیر مسلم فرقہ تصور کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اب تک نہایت فراخدلی بلکہ مسرفانہ رواداری کے نتیجے میں ملک کے بعض حصوں کے نصابِ تعلیم سے حضرت ابوبکرؓ اور فاروق اعظمؓ جیسے قابلِ فخر رہنماؤں کے احوال و سوانح بھی حذف کئے جا چکے ہیں۔ اور سنی اپنی روایتی وسعتِ ظرف یا ملی بے حسی کی وجہ سے یہ سب کچھ گوارا کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن کیا شیعہ حضرات کے موجودہ مطالبات کے بعد یہ سوال نہیں پیدا ہو سکتا کہ جب اکثریت انہیں اپنی طرح مسلمان سمجھتی ہے تو یہ لوگ بلا وجہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ کرانے پر کیوں مصر ہیں شیعہ سنی معتقدات میں بعض اصولی اختلافات کے باوجود بعض شیعہ فرقوں کو

چھوڑ کر عام طور پر اس اختلاف کو فروعی سمجھا جارہا ہے (جبکہ بعض اخباری مراسلات میں شیعہ حضرات اسے اصولی قرار دینے پر اصرار کر رہے ہیں۔)

۴۔ اگر فروعی اختلافات بھی اس علیحدگی کا سبب بن سکتا ہے تو خود اہل سنت کے اندر کتنے مکاتب فکر ہیں جو آگے چل کر جداگانہ حقوق اور مطالبات کا ہنگامہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں کی اکثریت حنفی مسلمانوں کی ہے۔ لیکن کیا فروعی اختلافات کی وجہ سے دیوبندی اور بریلوی الگ الگ دینی نصاب کا مطالبہ نہیں کر سکیں گے۔؟

پھر حنفی اور غیر حنفی تقسیم کریں تو مقلد اور غیر مقلد کی بنیاد پر علیحدگی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اہل حدیث ایک الگ جماعت ہے۔ جو کسی امام کی مقلد نہیں۔

تقلید کے دائرہ میں بھی یہاں دیگر ائمہ کرام کے پیرو موجود ہیں۔ شافعی بھی ہیں مالکی اور حنبلی بھی، کیا نہیں ان سب کے لئے الگ الگ نصاب بنانا پڑے گا۔ اور سب کے لئے مساجد اور مدارس، امامت اور خطابت اور ملک کے قانون و آئین میں الگ انتظامات کرتے ہوں گے۔ اور کیا کسی بھی مختلف مکتب فکر سے رکھنے والے دو چار افراد کی خاطر یہاں کی اکثریت حنفی مسلمانوں کی دینیات؛ ان کی فقہ ان کے آئین اور قانون کو مشق ستم بنایا جائے گا۔

اگر شیعہ فروعی اختلاف کی بناء پر علیحدگی کے حقدار ہیں تو خود شیعوں کے اندر آپس میں کتنے فروعی بلکہ اصولی اختلافات موجود ہیں۔ پھر کیا وہ اپنے دیگر مکاتب فکر اور گروہ در گروہ فرقوں کو بھی علیحدگی کا یہ حق دینے پر تیار ہوں گے۔

۵۔ عقائد اور نظریات کے لحاظ سے اس فیصلے کا جائزہ لیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ اہل سنت والجماعۃ اس صورتحال کو کس طرح برداشت کر سکیں گے۔ جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے وہ تمام صحابہؓ کو سرچشمہ ہدایت اور معیار حق سمجھتے ہیں۔ بالخصوص شیخین (حضرت صدیقؓ و حضرت فاروقؓ) کی افضلیت ان کا عقیدہ ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ (بشمول حضرت علیؓ و امامین ہمامین حسنؓ و حسینؓ) کی عظمت و حرمت اور ان کی تعدیل و تقدیس جزء ایمان سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ اہل بیت اطہار و ابرار کی قدر و منزلت بھی لازمۂ ایمان ہے۔

الغرض یہاں مثبت ہی مثبت پہلو ہے۔ کوئی منفیانہ ذہنیت کی بات نہیں امام عالی مقام علی المرتضیٰ کی حیثیت سنی نصاب میں خلیفہ راشد کی ہے۔ حضرات اہل بیت ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہیں فاطمہ بتولؓ کی حرمت پر مرمٹنا ہم سعادت دارین سمجھتے ہیں کسی بھی صحابیؓ کی بے ادبی کرنا ضیاع ایمان اور حبط اعمال اور دائمی خسران کا باعث سمجھتے ہیں۔ الغرض سنی نصاب میں اہل بیت اور ائمہ اطہار کی ادنیٰ گستاخی کا تصور

بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس نصاب میں نہ کسی کو غاصب کہا جاتا ہے نہ کسی کے حق کو غصب شدہ نہ کوئی ظالم ہے نہ مظلوم سب ابرار و اخیار، مقرب بارگاہ خداوندی اور "رحماء بینھم" کے مصداق ہیں موجودہ مروّج نصاب دینیات کے کسی کتاب کے کسی ورق اور کسی سطر سے شیعہ حضرات کی دل آزاری ہو جانے کی مثال نہیں دی جا سکتی۔

اب شیعہ معتقدات کو دیکھئے تو وہ سراسر اس کے خلاف ہیں ان کے علمی اور دینی کلچر میں چند ایک حضرات کو چھوڑ کر صحابہؓ کی اکثریت اسلام اور ایمان کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی (معاذ اللہ) صدیقؓ و فاروقؓ اور عثمان غنیؓ سمیت سب اجلۂ صحابہ نعوذ باللہ غاصب اور ظالم تھے۔ حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنین (رضی اللہ عنھن) کے بارہ میں ان کے عقاید کو کوئی غیور مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ خلافت میں ان کے ہاں صدیقؓ و فاروقؓ کی حیثیت ثانوی ہے۔ تقیہ (بوقت ضرورت جھوٹ) اور متعہ (مرد و زن کی باہمی رضامندی سے شہوت رانی) ان کے دین کے بنیادی اصول ہیں۔ صحابہ کرامؓ پر لعن و طعن، تبرّا بازی ان کا جزو دین ہے، "عقیدہ بدا" قرآن کی ابدیت اور شریعت کے ناقابل تنسیخ ہونے کی سراسر نفی کرتی ہے۔ اور اس طرح بیسیوں دیگر مسائل اور نظریات ہیں۔ جو ان کے ہاں دین کے اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں ان نظریات کی اچھائی یا برائی کی بحث میں پڑے بغیر ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا اہل سنت والجماعت مسلمان اپنے نونہال بچوں کے لئے ایک ہی سکول ایک ہی کلاس کی ایک ہی صف میں ایسی کتابوں، ایسے لٹریچر اور ایسے اساتذہ کی ایسی تعلیمات کو ایک لمحہ کے لئے گوارا کر سکیں گے جس میں ان کے محبوب اسلاف پر تبرّا بازی کی گئی ہو ان کو ظالم اور غاصب کہا گیا ہو، تقیہ اور متعہ کی شکل میں ان کے بچوں کی اخلاقی اور سماجی حالت بربادی کے خطرہ میں ہو آگ اور پانی کا یہ نباہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا اس طرح ہر سکول کے اکثریتی طبقہ کے بچوں کے دینی جذبات اور معتقدات مجروح نہیں ہوں گے۔ اس کا نتیجہ جس ہولناک اور بھیانک شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ چند وقتی مصلحتوں کی خاطر اس سے صرف نظر کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ حقیقت بین نگاہوں کا یہ اندازہ بجا طور پر درست ہے کہ اس طرح پوری سنی آبادی شیعہ معتقدات کی لپیٹ میں آ سکتی ہے۔ اور شیعہ عقائد کی بنیادی اور اہم سطح پر اشاعت اور تبلیغ کا دروازہ کھولا جا رہا ہے۔ پوری امت مسلمہ چند گنے چنے حضرات کی خاطر شیعیت کی بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکتی۔

اگر شیعہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نصاب میں ایسی کوئی دلآزار بات نہیں ہوگی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر نصاب کی علیحدگی کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اگر نصاب ایسے اختلافی

مسائل اور معتقدات سے دور رکھنا ہے تو پھر کروڑوں روپے کا بوجھ ڈال کر الگ نصاب جاری کرنے میں ان کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ بہرحال ایک دفعہ الگ نصاب کی داغ بیل ڈال دینے کے بعد اسکی کیا ضمانت ہے کہ آئیندہ اسے سنی بچوں کے عقائد کی دلآزارانہ آلائشوں سے دور رکھا جا سکے گا۔

۶۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ کیا علٰحدگی کا یہ مطالبہ صرف نصابِ تعلیم تک محدود رہ سکتا ہے۔؟ شیعہ کمیٹی کے مطالبات میں اوقاف کی علٰحدگی بھی شامل ہے۔ تبرا بازی (بر سرِ عام صحابہؓ پر سب وشتم) کی کھلی چھوٹ دئیے جانے پر اصرار ہے۔ آگے چل کر ان مطالبات کا دائرہ اور وسیع ہو سکتا ہے۔ فوج کی ہر یونٹ میں دو ایک شیعہ افراد کے لئے وہ سنی امام اور خطیب کے ساتھ شیعہ مجتہد اور امام کا بھی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح فوج بھی نظریاتی جنگ و جدال کا اکھاڑہ بن سکتی ہے۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی دیگر غیر مسلم اقلیتیں اور قادیانی بھی فوج میں اپنے مذہبی معاملات کیلئے الگ انتظام اور الگ الگ محکموں کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ ہماری ذاتی معلومات کی بنا پر ایک ذمہ دار عیسائی افسر ہر یونٹ میں مسلمان عالم کے ساتھ ایک پادری کے تقرر کی خواہش کر بھی چکے ہیں۔ قادیانیوں کو جو عمل دخل اور رسوخ حاصل ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں اس رسوخ کی بنا پر مرزائی اپنے مبلغین کی تقرری کا سوال بھی اٹھا سکتے ہیں۔ کیا یہ صورتِ حال ملک کے دفاع، سالمیت اور افواج کی یکجہتی اور یگانگت کیلئے مضر نہیں ہوگی۔

مزید آگے چل کر شیعہ اقلیت اپنے لئے سنی آبادی کے ہر محلہ اور ہر گاؤں میں الگ امام اور مجتہد کی تقرری کا ناقابلِ برداشت بوجھ بھی محکمۂ اوقاف پر ڈال سکتی ہے۔

۷۔ آزادیٔ رائے اور سیکولر ذہنیت سے متاثر اذہان کو شاید یہ صورتحال بہت پسند آئے۔ کہ ہر سکول اور تعلیمی ادارہ کی ۹۰، ۹۵ فیصد اکثریت سنی مسلمانوں کے ساتھ ۵، ۱۰ اقلیتی بچوں کی خاطر پانچ دس الگ الگ نصاب بھی رکھے جائیں۔ لیکن اس طرح اس نظریہ کا کیا حشر ہوگا جو قیام پاکستان کا باعث بنا، اور جسے اب کافی حد تک ہم خود اپنی ستم کاریوں ہی سے نیم مردہ اور بے جان کر چکے ہیں۔ یعنی — دو قومی نظریہ — ملک جس اکثریت کے نام پر بنا ہے اگر پاکستان میں اس اکثریت اور مجارٹی کو تعلیم جیسے بنیادی مسئلہ میں بھی قوتِ حاکمہ کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تھی اور اسے چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کے مساوی حصہ دینا تھا۔ تو کیا یہ مقصد ایک متحدہ سیکولر سٹیٹ کی شکل میں حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیا مسلمان برصغیر کی اقلیت رہ کر اس طرح مطالبات سے اپنے الگ تشخص کو برقرار

نہیں رکھ سکتے تھے۔ پس بلاشبہ اگر یہاں مجارٹی اور مینارٹی کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ تو مسلمانوں کو ایک مستقل ریاست کے نام پر تاریخ کی لامثال قربانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کیوں کرنا پڑا۔

الغرض جب ملک اکثریت کے نام پر بنا ہے۔ اقلیتی طبقات کے نام پر نہیں تو ایسے فیصلے ملک کی رہی سہی اساس اور بنیاد دو قومی نظریہ کو منہدم کرنے کے مترادف ہوں گے۔

۷۔ بلاشبہ ایک اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنے کلچر و تمدن کو برقرار رکھنے کی اجازت ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ اگر شیعہ وغیرہ کو سنی نصاب تعلیم پر اعتماد نہیں تو وہ اپنے لئے پرائیویٹ اداروں اور تعلیم گاہوں کی شکل میں اس کا انتظام کر سکتے ہیں اور کوئی اسلامی مملکت انہیں نہیں روکتی۔ لیکن وہ اس آڑ میں پورے ملک کے دینی نصاب کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتے نہ اکثریت پر اپنے عقائد کی تبلیغ کا جبری راستہ نکال سکتے ہیں۔ بھارت کی مثال ہمارے سامنے ہے جو نام نہاد سیکولر سٹیٹ ہونے کا دعویدار ہے۔ لیکن وہاں کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں ہندوانہ ذہنیت اور ہندو رسم و رواج اور تعلیمات سے مسلمان بچوں کے دین کو خطرہ لاحق ہو گیا تو مسلمانوں نے اس کے لئے الگ مکاتب، کچھ پرائیویٹ ادارے قائم کئے۔ مگر وہ بھارت کو مجبور نہیں کر سکے کہ ان کے لئے ہر سکول اور ادارہ میں الگ نصاب رکھا جائے۔

۸۔ اقتصادی اور معاشی لحاظ سے اس فیصلہ کا جائزہ لیجئے تو کیا ایک ایسا ملک جس کی ۷۵ فیصد آبادی اقتصادی بدحالی اور پسماندگی کی وجہ سے لازمی بنیادی تعلیمی سہولتوں سے بھی محروم ہے۔ جہاں کی دور افتادہ دیہاتی آبادیاں پرائمری تعلیم سے بھی ناآشنا ہیں، کسی ایسے دوہرے نصاب اور نظام تعلیم کی متحمل ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے تعلیمی مصارف دوگنا ہو جائیں۔ ہم موجودہ سکولوں کو فرنیچر بنیادی سامان اور ضروری سٹاف مہیا نہیں کر سکتے۔ تو چند ایک بچوں کی خاطر الگ نصاب، اس کے لئے الگ اساتذہ اور دو دو کتابوں کے اخراجات کہاں سے پورے کر سکیں گے۔ ان عظیم اخراجات اور مصارف کے نتیجہ میں فائدہ کتنا حاصل ہو گا۔؟

ہمارے خیال میں ملک کی ۷۰ فیصد بالخصوص دیہاتی آبادی ایسی ہے۔ جہاں کسی سکول میں آپ کو ایک بھی شیعہ بچہ نہیں مل سکے گا۔ ۳۰ فیصدی تعلیمی ادارے اور سکول ایسے ہوں گے، جہاں ایسے بچوں کی شرح دس فیصد سے کسی طرح زیادہ نہیں ہو گی۔ لیکن ایک عام پالیسی کے تحت ہر سکول کو نہ صرف دو نصاب فراہم کرنے ہوں گے۔ بلکہ متصادم نظریات اور تعلیم کے لئے الگ الگ اساتذہ بھی اس لئے کہ نہ تو کوئی سنی شیعہ نصاب پڑھانے پر آمادہ ہو گا۔ نہ شیعہ حضرات ایسے اساتذہ سے پڑھنا

گوارا کریں گے۔ پھر جب دینیات کے اساتذہ دونوں نصابوں کے لئے ضروری ٹھہرے تو فرض کیجیے ملک کے ۹۵ فیصد آبادی کے لئے ہمیں دس ہزار اساتذہ رکھنے ہیں تو ہم اتنی ہی تعداد ۵ فیصد آبادی کے لئے بھی رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ یہ صورتحال ملازمتوں کے تناسب سے کتنی قابلِ افسوس ہو گی۔

۹۔ ایک اور زاویہ سے دیکھئے تو قومی یکجہتی کے ساتھ حکومت کی دورخی پالیسی پر محوِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ کہ جب مسلمانوں کی اکثریت ایک مدت سے قادیانیوں کو الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تو اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کہ اس طرح قومی اتحاد مجروح ہوتا ہے۔ اور افتراق و انتشار کی راہ کھلتی ہے۔ یہاں تک کہ قادیانیوں کو دانستہ یا نادانستہ تحفظ دینے کی خاطر آئین میں نہایت اصولی مطالبہ "مسلمان کی تعریف اور مسلم کا تعین اور تشخص" کو بھی بے دردی سے ٹال دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ایک ایسے فرقہ کو علیحدگی کی راہ پر ڈال دیا جاتا ہے جسکی علیحدگی کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے کبھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اسے اپنے ساتھ ملائے رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ پہلا مطالبہ "قادیانیوں کی علیحدگی" قومی یکجہتی کے تحفظ اور سالمیت کی خاطر نہایت اصولی، معقول، اور ضروری ہے۔ جبکہ دوسرے مطالبے (شیعوں کی علیحدگی) سے قومی یکجہتی پاش پاش ہو جاتی ہے۔ گویا نہ تو قومی اتحاد برقرار رکھنے میں مسلمانوں کے مطالبات قابلِ اعتنا ہیں۔ اور نہ اس کے ٹوٹ جانے پر مسلمانوں کے اندیشے لائقِ التفات ہیں۔ ایسی دورنگی اور دورخی پالیسی پر سوائے حیرت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایک بات اور شیعہ حضرات کیلئے ان مطالبات کے ردِ عمل کی شکل میں قابلِ غور ہے۔ اگر ایسے مطالبات سنی مسلمانوں کی طرف سے شروع ہو جائیں کہ آئندہ الگ تشخص کی وجہ سے شیعہ حضرات کو سول سروس فوج وغیرہ کی ملازمتوں اور دیگر حقوق و رعایات میں بھی شرح آبادی کے تناسب سے کوٹہ مقرر کیا جائے تو کیا اس مطالبہ کو نامعقول کہا جا سکے گا۔ اس طرح اگر شیعہ حضرات اہلِ سنت سے اپنے اختلافات کو اصولی قرار دینے پر مصر رہے تو مسلمانوں کے لئے سوچنا ہوگا کہ ایسے اصولی اختلافات کے ساتھ کوئی شخص مسلمان کے دائرہ میں رہ سکتا ہے یا نہیں یا ایسے اصولی اختلافات کے ہوتے ہوئے کوئی اقلیت ملک کے کلیدی مناصب بشمول صدارت وغیرہ پر فائز رہ سکتی ہے یا نہیں۔؟ یہ اور اس قسم کے بیشمار مسائل اس کے ردِ عمل میں ظاہر ہو سکتے ہیں ــــ پھر شیعہ حضرات شاید اسے گھاٹے کا سودا سمجھ کر پچھتانے لگ جائیں مگر موقع ہاتھ سے جا چکا ہو گا۔

۱۰۔ آخر میں اس فیصلہ کو قابلِ عمل ہونے کے لحاظ سے دیکھئے کہ یہ جبری طور پر کہاں تک نافذ ہو

سکتا ہے۔ میرے خیال میں تعلیم کا مسئلہ زیادہ تر صوبائی حکومتوں سے وابستہ ہے۔ فرض کیجئے صوبہ سرحد یا بلوچستان اور ان کی دیکھا دیکھی کوئی اور صوبہ جداگانہ نصاب کے اس فیصلہ کو مسترد کر دیتی ہیں تو کیا مرکز اسے جراً ٹھونس کر کتنے خطرات میں ملک کو ڈال سکتی ہے۔ اور اگر صوبائی حکومتیں اسے نافذ کر بھی دیں لیکن جیسا کہ شیعہ حضرات کو اپنے عقائد اور نظریات عزیز ہیں، گروہی حمیت انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ سنی مسلمانوں کے بچوں اور تعلیمی اداروں کے اہلِ سنت نوجوانوں میں دینی وملی احساسات کا شعور بیدار ہوا اور ۹۵ فیصد لڑکوں نے اس فیصلہ کو مسترد کرنا چاہا تو ملک کے امن واماں کا کیا بنے گا۔ جبکی ملک کی تعمیرِ نو کے لئے نہایت اشد ضرورت ہے۔

ان خطرات کو دیکھتے ہوئے ملت کے اتحاد اور سالمیت کی خاطر ہماری دردمندانہ گذارش ہے کہ اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے ملک کو منافرت افتراق اور خانہ جنگی کے اور راستوں پر نہ ڈالا جائے پہلے سے لسانی، علاقائی اور قومی مسائل کا عفریت ہمیں ہڑپ کر رہا ہے اگر ملت کی شیرازہ بندی کرنے کی بجائے ایسے دیگر مسائل کو ہوا دی گئی تو اسے کسی سوچی سمجھی سازش کی ایک کڑی ہی سمجھا جائے گا۔ اور ملک کے باشندوں میں باہمی اعتماد اور خیر سگالی کی فضا قائم رکھنا مشکل ہو جائے گی۔ خدا اس روزِ بد اور اس کے نتائج سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق
۱۶ اگست ۱۹۷۲ء

مکہ معظمہ میں شیخ وقت مجاہد جلیل عارف باللہ مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کے فرزند اکبر مولانا حبیب اللہ مہاجر حرمین کا انتقال ہوا، مولانا مرحوم اپنے اولوالعزم والد کی طرح زہد وورع، فقر واستغناء توکل اور ریاضت کے عجیب مقامات پر فائز تھے۔ درویشی اور متوکلانہ زندگی کے عجیب نمونے اس دور پر فتن میں قائم کئے تقریباً ۳۰ سال مشقتوں سے بھری زندگی جوارِ حرمین میں گذاری اور اسی حال میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت لاہوری کے خاندان کا یہ گلِ سرسبد اپنے والد بزرگوار کی طرح طلبگاران راہ حق کے لئے مشعلِ ہدایت رہے گا۔

اسی ماہ لاہور ہی کے ایک نوجوان صالح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب کا بھی انتقال ہوا۔ یہ اپنے وقت کے جنید شیخ طریقت وشریعت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری مرحوم بانی جامعہ اشرفیہ کے خلف صالح تھے۔ اخلاص محبت اور شرافت کے پیکر۔ اس مرگِ جواں سالی پر کونسی آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو۔ دارالعلوم حقانیہ، ادارۂ الحق ہر دو مرحومین کے رفع درجات کا متمنی ہے۔ اور غمزدہ خاندان کے افراد سے برابر کا شریکِ غم۔

(سمیع الحق)

قومی اسمبلی

میں

معاہدہ شملہ پر شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب

کی

تقریر

۱۴ر جولائی ۱۹۷۲ء

- معاہدہ شملہ کی توثیق کے ساتھ یوم المیثاق اور اسلامی نظام کے لئے کئے گئے عہد ومیثاق کی توثیق بھی ضروری ہے۔
- مسلمان کسی سے دبنے یا کمزوری اور بے ہمتی کی وجہ سے معاہدہ نہیں کرتا۔
- مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اور راستے بھی کھلے رہنے چاہئیں۔
- آئندہ جو آئین بن رہا ہے وہ مکمل اسلامی ہو تب کامیابی ہو سکتی ہے۔
- بنگلہ دیش کے بارہ میں مذاکرات سے پہلے اس معاملہ میں سکوت مناسب ہے۔

محترم چیرمین صاحب اور معزز اراکین تین چار روز سے معاہدہ شملہ سے متعلق دو قسم کی آراء کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں آراء کا اختلاف ملک کے لئے مفید رہے گا۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ اختلاف امتی رحمۃ اختلاف اگر خلوص پر مبنی ہو تو موجب رحمت ہے۔ مخالفت میں اگر اس معاہدے کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے۔ تو میرا خیال یہ ہے کہ صدر محترم دوسری ملاقات میں مخالف آراء کی وجہ سے کچھ مزید مراعات حاصل کر سکیں گے۔ اور جن لوگوں نے موافقت کی وہ بھی مفید رہے گی۔ اس لئے کہ صدر پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کرنی چاہئے۔ اگر اس معاملہ میں ان کے ہاتھ ہم نے مضبوط کئے تو انہیں اور بھی عزم و ہمت سے کام کا موقع ملے گا۔ اور ممکن ہے وہ ان مختلف خیالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب دوبارہ مذاکرات کے لئے تشریف لے جائیں گے تو یہ خیال فرماویں گے کہ چونکہ اس سے ہماری قوم مطمئن نہیں، اس لئے ہمارے ساتھ کوئی اور قسم کا معاملہ کیا جائے تو اس سے جو بھی زائدہ ہوگا، وہ سب کے مفاد میں ہوگا۔ تو اختلاف امتی رحمۃ کی بنیاد پر جو بھی فیصلہ ان اختلافات کی روشنی میں ہوگا وہ باعث رحمت خداوندی ہوگا۔

ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ یہاں رونا اور واویلا ہو رہا ہے۔ کہ اس وقت ہم مسلمان بہت کمزور ہیں۔ میں اس خیال سے موافقت نہیں کرتا۔ اگر میری یہ نحیف آواز اندرا گاندھی اور ہندوستان تک پہنچ سکے تو میں یہ عرض کردوں گا کہ ہم اس لحاظ سے معاہدہ قبول نہیں کرتے کہ ہم کمزور ہیں کیونکہ جب جنگ بدر میں دنیا کے کافروں کے سامنے صف آرا ہوئے ہم تو وہ ہیں کہ ۳۱۳ تھے کہ خدا

نے ہماری امداد کی اور اعانت فرمائی اور اگر کہا جائے کہ اب وہ مسلمان کہاں! تو اس کے بارہ میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت تک میری امت میں ایک طائفہ ایسا ہوگا جو حق پر قائم رہے گا۔ تو اس طائفہ حق کی مدد خدا ہر حالت میں کرتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے مصداق بن جائیں۔ ہم نے عزم اور ہمت نہیں ہاری۔ پاکستان کیلئے اسلام کیلئے اپنی قوم کے لئے ہمارا بچہ بچہ خون کا آخری قطرہ بہانا نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ جنگ خندق میں تمام کفار، یہودی، مشرکین تمام قبائل غطفان وغیرہ جمع تھے اور ان کے مقابلہ میں صحابہ کرامؓ خندق کھود رہے ہیں، تن پر کپڑا نہیں ہے۔ کھانے کو روٹی نہیں لیکن پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں، کوئی خاص سامان جنگ نہیں ہے۔ لیکن ۲۴ ہزار کافروں کے مقابلہ میں صحابہؓ اعلان کرتے ہیں۔ کہ ؎

نحن الذین بایعوا محمدا　　　علی الجہاد ما بقینا ابدا

ہم وہ جماعت ہیں کہ جنہوں نے لا الہ الا اللہ۔ پڑھ کر جہاد کا معاہدہ کیا ہے کہ ہم آخری سانس تک جہاد کریں گے۔ میں یہ تمہیداً اس لئے عرض کرتا ہوں کہ شاید ہماری اسمبلی کے اس اجلاس سے بھارت یہ تاثر لے کہ پاکستان تو دب گیا ہے۔ اور وہ محض کمزوری کی وجہ سے صلح کر رہا ہے۔ اب تو ہم پانچ کروڑ ہیں اور اگر سارے اسلامی ممالک کو ملایا جائے جیسا کہ اسلام کا تقاضا ہے۔ المؤمنون کجسد واحد۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک جسد ہیں تو ہم ستر اسی کروڑ ہیں۔ لیکن یہ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان اپنے اسلام اپنے ملک کے تحفظ کیلئے ہر قربانی کیلئے تیار ہیں۔ ہمارے عزم اور ہماری ہمتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جیسا کہ ۱۹۶۵ء میں تھا، انشاء اللہ اب بھی وہی ہوگا۔

—— تو اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ کہیں ہماری ان تقاریر سے مسز اندرا گاندھی اور انڈیا یہ نہ سمجھے کہ اب پاکستان دب گیا ہے، اب وہ کمزور ہو گیا ہے۔ ہماری نصف سے زیادہ آبادی ہم سے چھن گئی ہے تاریخ میں ایسا ہوا کرتا ہے۔ ہمارے ایک لاکھ سپاہیوں کو انہوں نے محبوس کر دیا ہے میں تین باتیں عرض کرتا ہوں:

ایک تو یہ کہ ہم نے اس معاہدہ امن کو جو تسلیم کیا ہے وہ کمزوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کی وجہ سے۔ المومن من امنہ الناس علی دماءھم واموالھم حضورؐ فرماتے ہیں کہ مؤمن کی شان یہ ہے تمام لوگوں کا خون ان کی عزت آبرو اس سے محفوظ ہو ہم کافروں کی طرح نہیں ہیں کہ عورتوں اور بچوں پر بھی ہاتھ اٹھائیں بوڑھوں مریضوں کو قتل کرنے سے ہمیں اسلام نے منع کیا ہے۔ شکر ہے کہ ۲۵ برس سے انڈیا امن کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ اور خدا کے ارشاد کے مطابق وان جنحوا للسلم فاجنح

تھا، توکلاً علی اللہ ۔ اگر دشمن نے ہاتھ بڑھایا صلح کی طرف تو ہم بھی صلح کا ہاتھ بڑھائیں گے اللہ پر توکل اور اس پر بھروسہ اور سہارا ضروری ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہے کہ وان نکثوا ایمانہم اور اگر انہوں نے معاہدہ توڑ دیا تو ہم بھی خاموش نہیں بیٹھیں گے، بلکہ برابر کا سلوک اور رویہ اختیار کریں گے۔ اس لئے ہم خدا پر بھروسہ اور توکل کرتے ہوئے امن کے ہاتھ کو کھینچنا نہیں چاہتے ۔ ہم چاہتے ہیں کہ آئندہ جو بھی معاملات ہوں امن سے فریقین کے باہمی مذاکرات، مصالحت اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں طے پائیں ۔ اس لحاظ سے ہم اس تجویز اور معاہدہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے قبول کرنے کو تیار ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ پچیس ۲۵ سال سے ہماری ملک کی جو لڑائیاں ہو رہی ہیں ۔ اس کا مدار کشمیر ہے ۔ تو اگر کشمیر کا معاملہ طے نہ ہو تو چاہے ہم کتنے معاہدے کرتے رہیں یہ لڑائیاں جاری رہیں گی ۔ تو سب سے پہلے ضروری ہے کہ جموں کشمیر کے معاملہ کو طے کرانے کا پورا لحاظ رکھا جائے ۔ جیسا کہ معاہدہ میں کہا گیا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی پوزیشن کا لحاظ رکھتے ہوئے امن کے ساتھ اس معاملے کو طے کریں گے ۔۔۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کشمیر کا معاملہ اسلام کے حق میں مسلمانوں کے حق میں اور کشمیریوں کے حق میں بین الاقوامی قوانین اور حق خود ارادیت کے مطابق طے کرا دے ۔ لیکن اگر ان کا خیال ہے، کہ دونوں فریقین جب متفق ہوں تب یہ بات طے ہو گی اور جب وہ متفق نہیں ہوں گے تو کشمیر کے حل کی نوبت ہی نہ آئے گی ۔ یعنی اگر معاہدے کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندوستان راضی نہ ہو تو ہم کشمیر کے بارہ میں خاموش رہیں گے ۔ تو ہمیں واضح کر دینا چاہئے کہ ہم اس کے بعد اسلام کی رہنمائی میں دوسرا قدم اٹھائیں گے ۔ اسلام نے اس بارہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ حدیبیہ میں صلح ہوتی ۔ مگر دو برس بعد مشرکین مکہ نے معاہدہ توڑا، چڑھائی کی، غداری ہوتی تو مسلمانوں نے بھی معاہدہ کو چھوڑ دیا اور حملہ کر کے مکہ معظمہ کو فتح کر لیا ۔ ایسی صورت میں یہی حالت انشاء اللہ یہاں بھی ہو گی۔

مسٹر سپیکر :۔۔۔ مولانا صاحب ! کچھ اختصار کریں۔

مولانا عبدالحق صاحب :۔۔۔ محترم سپیکر صاحب ! بنگلہ دیش کے بارہ میں بھی ایک میرا مشورہ ہے ۔ صدر پاکستان نے بنگلہ دیش سے متعلق اب تک کچھ نہیں کہا نہ شاید مذاکرات ہوئے ہیں ۔ اس لئے ہمیں بھی اس بارہ میں سکوت اختیار کرنا مفید اور مناسب ہے۔

دیکھئے اگر آج ہم یہاں کہیں کہ ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں تو پھر آئندہ مذاکرات میں ہمارے صدر صاحب کی پوزیشن کمزور ہو گی ۔ اگر وہ اس سلسلہ میں مصلحتاً سخت موقف اختیار کریں گے ۔ تو بھارت کہے گا کہ تمہاری اسمبلی نے تسلیم کرنے کی بات کی ہے تم کیسے نہیں مانتے ۔ اور اگر ہم کہیں کہ بنگلہ دیش کو کسی

حال میں تسلیم نہیں کرتے تو آئندہ مذاکرات میں پھر بھی صدر کی پوزیشن کمزور ہو گی کہ تمہاری اسمبلی بھی تمہارا ساتھ نہیں دیتی۔

تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب تک بنگلہ دیش کے بارہ میں مذاکرات سے واضح صورت سامنے نہیں آتی اس وقت تک ہمیں اس طرف سے خاموشی اختیار کرنی چاہیے اس کے بعد انشاء اللہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہوگا اور ہم فیصلہ کر سکیں گے۔

۳۔ تیسری اور اہم گذارش یہ ہے کہ آج میثاق شملہ کی توثیق کرتے ہوئے یوم المیثاق کے عہد و پیمان کی توثیق بھی ہونی چاہیئے کہ جب پیدائش سے قبل ہمارے رب نے پوچھا ۔ الست بربکم۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ قالوا بلیٰ۔ ہم سب نے ربوبیت اور حاکمیت کا اعتراف کیا، تو وعدہ کیا۔ اس عہد کا لحاظ ہر وقت ضروری ہے۔

اور پھر ہم نے قیام پاکستان کے وقت ایک عہد اور ایک معاہدہ کیا ایک میثاق ہوا اللہ اور رسول سے کہ ہم اس ملک میں خدا ، رسول اور اسلام کا نظام مکمل طور پر نافذ کریں گے۔ اس لئے اس میثاق کی توثیق کرنے کے ساتھ اس میثاق کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ آئندہ جو آئین بن رہا ہے وہ اسلامی ہو عہد کی تجدید و توثیق ہو تو ہم کامیاب ہوں گے۔

بقیہ ۔ اسمبلی میں تقریریں ..... گزارتے ہیں، انگریزوں میں جاتے ہیں، ہم اتوار کو کیا کرتے ہیں؟ کہ ہم نے اسے منتخب کر لیا ہے۔ یہ صرف تشابہ ہے۔ دیگر قوموں سے ہر قوم کا یونیفارم ہوتا ہے۔ تہذیب اور تمدن ہوتا ہے۔ ہم اپنے ثقافت اپنے طریقوں اور تہذیب و تمدن کو اپنا کر ہی الگ وجود قائم رکھ سکتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ اگر میری حکومت میں حضورؐ کی ایک سنت بھی زندہ ہو اور اس کی وجہ سے میرا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو میں کامیاب ہوں گا۔

— تو میری ادھر کے حضرات سے بھی اور پیپلز پارٹی کے بھائیوں سے بھی اپیل ہے کہ یہ مسئلہ طے کر دیں۔ یہ آپ کے کارناموں میں سے ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔

اگر سید الایام جمعہ کو ہم چھٹی منائیں تو مزدور ملازم طبقہ نماز میں بآسانی شامل ہو سکے گا۔ عیسائیوں کے تشابہ سے بچ جائیں گے۔ محنت کے لحاظ سے اقتصادی فائدہ ہوگا۔ حضور اقدسؐ اور صحابہؓ کے زمانہ میں جمعہ کو تو طلوع شمس کے ساتھ ہی لوگ مسجدوں میں آجاتے تھے۔ اگر چھٹی نہ ہو تو کون ہے جو جمعہ کی نماز کو پہنچ سکے ..... اس بنا پر میں قرارداد کی حمایت کرتا ہوں۔

قومی اسمبلی

ادارۂ الحق

شیعہ نصاب

کی علیحدگی کے بارے میں

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کی

تحریکِ التواء تیسری بار مسترد کردی گئی

اخبارات میں شیعہ نصاب دینیات کو الگ کر دینے کے بارہ میں حکومت کے بعض اخباری اعلانات سے جو بے چینی اور اضطراب پھیلا، اس کے بارہ میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب ممبر قومی اسمبلی نے اسلام آباد اسمبلی میں شرکت کیلئے تشریف لے جانے سے قبل صدر محترم سے ایک اخباری بیان میں اپیل کی کہ قومی اتحاد اور ملکی سالمیت کی خاطر اس فیصلہ پر نظر ثانی کی جائے۔ یہ بیان پشاور کے روزنامہ مشرق پشاور کے علاوہ کسی نے شائع نہ کیا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران آپ نے اس بارہ میں ایک تحریک التواء داخل فرمائی کہ اسمبلی میں اس مسئلہ پر عام بحث کی جاسکے۔ یہ تحریک التواء اور پھر اس موضوع پر مولانا عبدالحکیم صاحب ہزاروی کی تحریک سپیکر صاحب نے یکے بعد دیگرے خلاف ضابطہ قرار دیکر مسترد کردی۔ مگر شیخ الحدیث مدظلہ نے ۱۱ر اگست کو اجلاس شروع ہوتے ہی اس مسئلہ کو پھر اسمبلی میں اٹھایا اور تحریک کے استرداد پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے فرمایا:

کہ جناب سپیکر صاحب شیعہ نصاب کی علیحدگی اور اسلام کی تاریخ کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی خبریں اخبارات میں آچکی ہیں۔ اس فیصلہ سے ۹۵ فیصد اہل سنت آبادی اور ملک کی قومی یکجہتی متاثر ہو سکتی ہے۔ بھائی چارہ ختم ہو جائے گا۔ ہمارے فکری اتحاد کو ٹھیس پہنچے گی۔ اور یہ بات سیاسی، اعتقادی، اقتصادی، فکری، مذہبی، ہر لحاظ سے ہمارے لئے نقصان دہ ہوگی ——— اس لئے جناب سپیکر میری تحریک پر بحث کی اجازت دیں۔

سپیکر :- اس پر ایک دفعہ فیصلہ ہوچکا ہے۔

مولانا عبدالحق :- جناب یہ ملک کا اہم مسئلہ ہے، ہم سب استحکام پاکستان کا حلف اٹھا

چکے ہیں۔ جہاں بھی ہمارے اتحاد میں شگاف پیدا ہوگا، ہمیں اس کو بند کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اس بات سے قوم میں انتشار پیدا ہونا لازمی ہے۔ اور مسئلہ بڑا اہم ہے اس لئے بحث کی اجازت دی جائے۔

سپیکر:- اسمبلی کے قواعد کے مطابق وہ ایک دفعہ رد ہو چکی ہے۔ اور رد ہونے کی وجوہات اسمبلی کے سیکرٹریٹ کے دفتر سے آپ کو مہیا کی جا سکتی ہے۔

★

تحریک مسترد ہوئی، مگر اس طرح اس اہم مسئلہ پر قومی اسمبلی کے ارکان تک بات پہنچ گئی، دوسرے دن ۲۲ر اگست کو جنگ، نوائے وقت، پاکستان ٹائمز وغیرہ میں بھی اس کا ذکر آیا۔ اس کے بعد ۲۲ر اگست ہی کو آپ نے نئے سرے سے تحریک التواء کو مرتب کر کے اسمبلی سیکرٹریٹ میں داخل فرمایا۔ جس پر بحث کی اجازت کا مسئلہ ۲۵ر اگست کو ایوان میں زیر بحث آیا۔ مگر سپیکر نے اسے بالآخر مسترد کر دیا جسکی تفصیل یہ ہے:

سپیکر صاحب:- مولانا عبدالحق صاحب! آپ نے دوسری دفعہ تحریک التواء ۲۲ کی تحریک کی ہے، یہ شیعہ نصاب کے متعلق ہے۔ آپ نہایت مختصر الفاظ میں قاعدہ کی رو سے یہ جواز پیش کریں کہ وہ کون سے قاعدہ اور ضابطہ کے تحت اسمبلی میں آسکتی ہے۔

مولانا صاحب:- جناب سپیکر صاحب! یہ تحریک قاعدہ ۵۲، ۵۳، ۵۴ کے تحت زیر بحث آسکتی ہے۔ ۵۲ یہ ہے کہ کسی حالیہ معاملہ کے متعلق ہو تو شیعہ نصاب کی تجویز حالیہ ہی ہے۔ ۵۳ یہ ہے کہ عوامی ہو تو میری تحریک کا جس معاملہ سے متعلق ہے، یعنی نصاب تعلیم اس کی لپیٹ میں شیعہ سنی پوری آبادی آسکتی ہے۔ اور ساری قوم پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس لئے عوامی ہے۔ ۵۴ یہ ہے کہ کسی حتمی معاملہ کے متعلق ہو تو تعلیمی نصاب کی شیعہ سنی بنیاد پر تقسیم ایک حتمی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

جناب عبدالحفیظ پیرزادہ وزیر تعلیم:- جناب والا آپ کی اجازت سے میں مولانا صاحب کی توجہ پرسوں کے وقفہ سوالات کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ غالباً مولانا صاحب کو یاد ہو گا کہ ایسا ہی سوال مفتی محمود صاحب نے کیا تھا۔ اب مولانا عبدالحق صاحب تیسری مرتبہ اس تحریک التواء کو پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ جس فیصلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی فیصلہ نہیں ہے۔ میں نے اس قدر کہا تھا کہ دینیات کے سلسلہ میں پہلی اکتوبر سے نیا نصاب آرہا ہے۔ صدر صاحب نے صرف اس قدر بات کی ہے۔ اور اجازت دی ہے کہ اس بارہ میں ایک کمیٹی فیصلہ کرے، جس میں دونوں طرف سے علماء جن میں غالباً مولانا صاحب بھی شامل ہوں گے۔ اور مولانا کوثر نیازی اس کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے۔ یہ کمیٹی پہلی اکتوبر تک فیصلہ کر دے

اس لئے میں مولانا عبدالحق صاحب سے گذارش کروں گا۔ کہ اس وقت تک اس تحریک التواء کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ان کو اس سلسلہ میں کوئی تشویش نہیں ہونی چاہیئے۔

مولانا عبدالحق صاحب :- جناب سپیکر صاحب ! یہ تو اخباروں میں آچکا ہے۔ اور ساری قوم کو اس پر تشویش ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی :- جناب میں مولانا عبدالحق صاحب کی تحریک التوا کی تائید میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سپیکر :- میں مولانا عبدالحق صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر اس معزز ایوان کا ایک معزز وزیر یقین دلادے کہ ابھی فیصلہ حتمی نہیں ہے کمیٹی فیصلہ کرے گی تو کیا وہ تحریک واپس لے سکتے ہیں۔ بعد میں اگر ایسا کوئی وقوعہ پیش آجائے تو پھر آپ کر سکتے ہیں۔

مولانا عبدالحق صاحب :- میرا بحث کرنا مقصد نہیں، صرف سمجھنا مقصود ہے یہ تو معلوم ہے کہ شیعہ حضرات ایسا مطالبہ کر چکے ہیں، الگ نصاب تعلیم جاری کرانے کا۔ اگر کمیٹی جس کا وزیر تعلیم صاحب نے ذکر کیا ہے کے متعلق کوئی قطعی یقین دہانی ہوجائے کہ وہ ایسا فیصلہ نہیں کرے گی تب مجھے اطمینان ہوگا۔

سپیکر :- نہیں وہ کہتے ہیں کہ کمیٹی فیصلہ کرے گی۔ تو معزز ارکان اسمبلی کو قدرتی طور پر اطمینان کرنا چاہیئے۔

شاہ احمد نورانی :- جناب سپیکر صاحب اگر ...

سپیکر :- بحث کی اجازت اس لئے نہیں دے سکتا .... تو کیا مولانا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے تحریک واپس لے لی ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب :- جناب عالی اگر وزیر تعلیم کی یقین دہانی ہوجائے کہ کمیٹی جو بھی نصاب بنائے گی اس میں تقسیم نہیں ہوگی ——— ملکی اتحاد اور سالمیت مقصد ہے۔

سپیکر صاحب :- وہ اس وقت نہیں کہہ سکتے کہ کمیٹی کس طرح فیصلہ کرے گی۔ تو جس بات کا فیصلہ نہ ہو، اور ہو سکتا ہے کہ آپ خود بھی فیصلہ کرنے والوں میں ہوں تو کیسے کہا جا سکتا ہے۔ تو اس تحریک کو زیر بحث لانا بے کار ہے۔

شاہ احمد نورانی :- مولانا عبدالحق صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کمیٹی کا غور کرنا ہی ملک میں افتراق پیدا کرنا ہے اور ملکی سالمیت کے خلاف ہے۔

سپیکر صاحب :- میں بول رہا ہوں کہ تحریک اس وقت نہیں پیش کی جاسکتی ہے کہ واقعہ وقوع پذیر ہو چکا ہو۔ اس لئے میں اس تحریک التوار کو مسترد کرتا ہوں۔
(ماخوذ از نوائے وقت، پاکستان ٹائمز، جنگ راولپنڈی، جنگ کراچی، مشرق کراچی وغیرہ)

کیا ہم ہمیشہ یورپ کے تابع رہیں گے۔؟

قومی اسمبلی میں تعطیل جمعہ کی قرارداد

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق صاحب کی تقریر

۲۴ اگست کو قومی اسمبلی میں غیر سرکاری کارروائی کا دن تھا۔ تعطیل جمعہ کی قرارداد زیر بحث آئی کہ آخر ۲۵ سال سے آزاد ہوتے بھی اتوار کی تعطیل کا کیا جواز ہے۔؟ حزب اقتدار کی اکثریت پہلے سے اسکی مخالفت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور ایسے موقع پر ان کی حسب سابق وکالت لاہور کے ڈاکٹر سید محمود بخاری نے کی۔ انہوں نے زیادہ تر زور قرآن کی آیت فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع۔ پر لگایا کہ کاروبار نہ ہوتا تو بند کیسے ہوتا۔ پھر نماز کے بعد فانتشروا فی الارض۔ میں زمین پر پھیلنے کا حکم دیا گیا۔ اس کا ترجمہ یوسف علی کی انگریزی تفسیر سے اور وہیں حاشیہ سے مفسرین کے بھاری بھرکم حوالے، اور نام پیش کئے حالانکہ یہ ساری محنت وکاوش ایک ایسی بات پر تھی جو متنازعہ ہی نہ تھی اور اس سے زیر بحث چھٹی کا تعلق ہی نہ تھا۔ نہ علماء کو آیت کے اس مفہوم سے اختلاف تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کھینچ تان کر اسے تعطیل کی مخالفت سے چپکانا چاہتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسلام میں چھٹی کا تصور یہود کے نظریہ سے مستعار ہے۔

آگے چل کر آپ اتوار کے تقدس اور تاریخی اہمیت پر افرائے اور انسائیکلوپیڈیا کے سایہ میں اسے جمعہ پر برتری دینے لگے۔ ایک استدلال یہ آیا کہ چھٹی سے قوم کاہل ہو جاتی ہے۔ اقتصادی لحاظ سے کام اور محنت رک جانے سے نقصان ہوگا۔

مولانا عبد الحکیم نے کہا کہ اتوار تو ہے ہی کاہلی کیلئے شراب پینے کے لئے۔ پھر اس کو بھی ختم کیا جائے۔ جناب خورشید حسن میر کا محکمہ متعین نہیں۔ تو بقول مولانا شاہ احمد نورانی صاحب ہر بات اور مسئلہ میں ٹانگ اڑانا ہی ان کا محکمہ بن گیا ہے۔ اٹھے اور کہا کہ ہر بات میں مذہب کو ٹانگنا ایک عادت بن گئی ہے۔ حالانکہ جمعہ کوئی مذہبی معاملہ نہیں۔ جناب محمد حنیف وزیر محنت نے جمعہ کی مخالفت سے زیادہ ڈاکٹر محمود بخاری کی وکالت کی اور کہا کہ انہیں اگر قرآن کے تلفظ اور تلاوت پر قدرت نہیں تو اس پر علماء نے تعجب کیوں کیا۔ ہم اتنے

گئے گذرے تو نہیں کہ ترجمہ بھی نہ سمجھ سکیں۔ پھر تان علامہ اقبال کے شعر —— یہ امت روایات میں کھو گئی —— پر ٹوٹ گئی۔

اس بے ہنگم بحث و مباحثہ کے دوران حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق بار بار اٹھ کر تقریر کی اجازت لیتے رہے۔ مگر سپیکر برابر نظر انداز کر دیتے۔ پیپلز پارٹی کی طرف سے جناب احمد رضا قصوری اور کسی حد تک غلام رسول تارڑ صاحب نے اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کی۔ احمد رضا صاحب تو کافی حد تک کلمۂ حق کہہ چکے اور کہا کہ جب دین ہمارا اسلام ہے۔ یہ ہمارے منشور کی بنیادی بات ہے۔ اور کتاب و سنت کی رعایت کرنا آئین کا حصہ ہے تو ہم کیوں جمعہ کے نام سے بھی چڑھتے ہیں۔

جناب محمد حنیف وزیر محنت کے بعد حضرت شیخ الحدیث نے تقریر کی اجازت چاہی اور بحمداللہ موضوع کے اہم گوشوں پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ پریس گیلری میں ممتاز صحافیوں سے سنا گیا کہ یہ آج کی بحث پر جامع اور مکمل تقریر تھی۔ آپ کے بعد حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی نے بھی عالمانہ تقریر فرمائی۔ یہاں ہم حضرت شیخ الحدیث کی تقریر درج کرتے ہیں:

جناب سپیکر صاحب! معزز ممبران نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ جمعہ محترم اور مقدس ہے، علماء نے بھی اتنی ہی بات کہی کہ جمعہ مقدس ہے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جمعہ کا احترام تسلیم کرتے ہوئے جمعہ کی تعطیل پر کیوں مولوی کو کوسا جاتا ہے۔ نماز فرض ہے، اسکی فرضیت تسلیم مگر جب مولوی کی زبان سے یہ بات نکلے تو کہا جائے کہ مولوی نے قوم اور اسلام کو داؤ پر لگایا۔ (ڈاکٹر محمود بخاری نے آیت جمعہ کے بارہ میں جو غلط بحث کی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تعطیل اور رخصت کا تعلق مزدور ملازم پیشہ اور کسی اور طرح پابند افراد سے ہے۔ جو لوگ اپنی آزادی اور مرضی سے کاروبار کرتے ہیں۔ دوکاندار ہیں، زراعت پیشہ وغیرہ ہیں، جو کام میں پابند نہیں، ان کو ہم نے کب نماز جمعہ سے قبل یا بعد میں کاروبار کرنے سے روکا ہے۔ یا کب آیت کے اس مفہوم سے ہم انکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خدا کا حکم ہے: اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع۔ جب جمعہ کی نماز کے لئے پکارا جائے تو دوکاندار، زراعت پیشہ کھیل کود خرید و فروخت میں مصروف لوگ اپنے کام چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑیں۔ لیکن ایک شخص سرکاری ملازم ہے، مزدور ہے، جس کو مالک اجازت نہیں دیتا یا بروقت وہ تیاری نہیں کر سکتا۔ وہ کس طرح جمعہ کی نماز پڑھ سکتا ہے —— تو آزاد لوگوں کے لئے نہیں بلکہ وہ جو کارخانوں میں دفتر وں میں ملازم اور پابند ہیں، تعطیل کا تعلق ان سے ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس تعطیل سے سارا نظام معطل ہو جائے گا۔ تو کیا ایک دن بعد اتوار کی چھٹی سے کوئی نظام معطل نہیں ہوتا ہے۔ جب کہ مولوی نہیں بلکہ اللہ

کہا ہے تو کہتے ہیں نظام معطل ہوتا ہے۔ اب اس لحاظ سے دیکھیے کہ اقتصادی لحاظ سے اتوار کو نقصان زیادہ ہے۔ یا جمعہ کے تعطیل کی شکل میں آپ اتوار کو تو چھٹی مانتے ہیں، جمعہ کو بھی ساڑھے بارہ بجے تعطیل کر لیتے ہیں۔ تو اس طرح ڈیڑھ دن ہو جاتے ہیں اور اتوار کی بجائے پورے جمعہ کو ایک دن بنتا ہے۔ اور وہ ڈھائی گھنٹے مزید نقصان محنت کے لحاظ سے بھی ہوا۔ اگر کام کے لئے ہمیں وقت درکار ہے تو ڈیڑھ کی بجائے ایک دن جمعہ کو چھٹی کیجئے کہ کارخانے ترقی کر سکیں۔ اقتصادی فائدہ یہ ہوگا۔ وہ نہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی کہ بنکوں وغیرہ کے کاروباری امور میں دیگر ممالک سے تعلقات میں فرق پڑتا ہے۔ تو اول تو یہ کہ اسلامی ممالک افغانستان، لیبیا، اردن سے مراکش تک جمعہ کو تعطیل کرتے ہیں۔ کیا وہاں کا سارا نظام معطل ہو گیا ہے۔؟ کیا ہم ہمیشہ یورپ کے تابع ہو کر رہیں گے؟ کہ وہ کہیں ادھر چلو تو ادھر کا رخ کیا، اس طرف چلو تو ادھر چلے ـــــ تو ان ممالک کا جمعہ کی تعطیل سے کوئی نظام معطل نہیں ہوا۔

دینی لحاظ سے دیکھئے، تو پانچ وقت نماز تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ یہ نمازیں انفرادی بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک جمعہ ہی ہے جو بغیر جماعت امامت، خطبہ کے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے دور دراز دیہات سے، دور دراز کارخانوں سے جامع مسجدوں میں آنا پڑتا ہے۔ اگر صرف ڈیڑھ گھنٹہ چھٹی ہو تو ایک دیہاتی کیسے پہنچ سکتا ہے۔ ایک مزدور کارخانہ سے آکر کیسے (غسل، کپڑے بدلنا وغیرہ) ساری تیاری کر سکتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم خدا کے نزدیک ماخوذ ہوں گے۔ اور ایسے لوگوں کے ترکِ صلوٰۃ کے ذمہ دار بھی ہم ہوں گے۔ مجھے واہ فیکٹری کے ایک مزدور نے رو رو کر شکایت کی کہ جمعہ کے لئے بھی ہمیں اجازت نہیں مل سکتی۔ بخاری شریف میں ایک حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبروں کی وساطت سے ان کی امتوں پر یہ بات پیش ہوئی کہ ہفتہ میں ایک دن اپنے لئے منتخب کر لو۔ تو عیسائیوں نے اتوار کا دن منتخب کیا کہ اس دن تخلیقِ عالم شروع ہوا تھا۔ یہودیوں نے کہا کہ جمعہ کے دن کائنات مکمل ہو چکی اور عصر کے وقت حضرت آدمؑ پیدا کئے گئے۔ ہفتہ کے دن تخلیق سے خالی تھا ہم بھی اسی دن کو چھٹی کریں گے۔ تو حضورِ اقدسؐ نے فرمایا: فهدانا الله۔ اللہ نے ہمیں جمعہ کی طرف ہدایت دی کہ وہ یوم الفراغ للعبادۃ ہے ـــــ

ـــــ تو کون کہتا ہے کہ وہ کاندار دوکان، کارخانہ دار کارخانہ بند کر دے، زمیندار زمینداری چھوڑ دے۔ اس کے لئے دو ڈھائی گھنٹے کام کاج ترک کرنے کا حکم ہے۔ (مگر جو ملازم ہیں یہ جھگڑا ان کیلئے تو رہا ہے۔) اور جب ہمیں ہفتہ میں ایک دن چھٹی کرنا ہی ہے۔ تو وہ اتوار کی بجائے جمعہ کو کیوں نہ ہو۔

اس بنا پر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ اسی طرح نہ چھوڑا جائے۔ اتوار بھی عیسائی عبادت میں

باقی صفحہ ۱۸ پر

قومی اسمبلی
۱۶ر اگست ۱۹۷۲ء

ہماری عزت

صرف اسلام سے ہے تو ہمیں اسلام کے نام سے نفرت کیوں ہے؟

۱۶ر اگست کو قومی اسمبلی کے اجلاس (تیسرے سیشن میں) پیش شدہ ترمیم پر کہ ملک کا نام مستقل آئین میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" ہونا چاہیئے، بحث میں حصہ لیتے ہوئے ممبر نیشنل اسمبلی شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے تقریر فرمائی جس کا اخبارات میں بھی بہت مختصر ذکر آیا ہے۔ ہمیں اسمبلی سیکریٹریٹ نے جتنا حصہ فراہم کیا اسے یہاں پیش کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

مولانا عبدالحق صاحب: جناب اسپیکر صاحب! میں یہ عرض کروں گا، کہ اس ہاؤس میں ہر قسم کے حضرات تشریف فرما ہیں۔ اور سب کے سب مسلمان ہیں۔ ان کا مذہب اسلام ہے۔ کل بھی ہمیں بلکہ تین مرتبہ ہم سے حلف لیا گیا ہے کہ اسلامی نظریہ کیلئے کوشاں رہیں گے۔ اور اس عبوری آئین میں بھی لکھا ہے کہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" (دفعہ ۲ میں صاف لکھا ہے) حضرت سلمان فارسیؓ جب ایران کے گورنر ہوکر آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ جواب ملا، اسلام۔ تمہارے باپ کا نام؟ اسلام، تمہارا مذہب؟ اسلام بیت المقدس میں جب حضرت عمرؓ فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔ تو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ لباس تبدیل کر دیں تاکہ کچھ عزت اور وقار کافروں کے دلوں میں پیدا ہو۔ حضرت عمرؓ نے ناراض ہوکر انکار کر دیا۔ اور فرمایا: نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام۔ ہمیں خدا نے اسلام ہی سے عزت دی ہے۔ عزت لباس وغیرہ سے نہیں۔ عبوری آئین میں بھی لکھا گیا ہے ——— اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ تو ہم اسلام کی اشاعت کریں گے۔ اسلامی نظریہ کو نہیں بھولیں گے۔ اگر ہم نے اسلام کا لفظ استعمال نہ کیا۔ تو عوام یہ تاثر لیں گے۔ کہ عبوری آئین میں اسلامی جمہوریہ لکھا گیا تھا۔ اور اب مستقل آئین میں اسلامی جمہوریہ نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ تمام ملک میں پھیل جائے گا۔ کہ حکومت ملک کا نام سوشلسٹ جمہوریہ رکھنا چاہتی ہے۔ یا کمیونسٹ پارٹی پبلک قسم کا، جیسا کہ ایک معزز ممبر نے اپنی تقریر میں تجویز بھی پیش کی۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ پاکستان کے ساتھ اسلامی لفظ یعنی اسلامی جمہوریہ جو کہ عبوری آئین

کے صفحہ اوّل میں لکھا ہے۔ درج کردیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم اسلام کے نام سے کیوں بھاگتے ہیں۔ اور کیوں نفرت کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے تمام مسائل کا حل اسلام میں ہے۔ خدا کی قسم جب تک ہم اسلام کا نام لیتے" رہیں گے۔ ہم اس نام کی برکت سے دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ اور آخرت میں بھی کہ اس نام کی برکت سے جنت میں جائیں گے۔ میں کہتا ہوں۔ نام کو بھی ہم نکال دیں۔ روحِ اسلام تو ہم نے پہلے سے نکال دی ہے۔ تو ہم کیا رہ جائیں گے۔

ہم صدر محترم ذوالفقار علی بھٹو کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور ان کی ہمت کے معترف ہیں۔ اور ہمیں ان سے توقع ہے کہ مکمل اسلامی آئین کے نفاذ کا اعلان کردیں۔ اور اگر وہ کھل کر اسلام کے بارہ میں بھی واضح اعلان کریں۔ تو قوم مطمئن ہو جائے گی۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ ہم چاہتے کہ ہم اپنی قوم میں غلط تاثر پیدا نہ کریں۔ اسلام کے نام کو بھی فروغ دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ کا نام اس میں ضرور ہونا چاہیئے (ختم)

نوٹ: آخری اطلاعات آنے تک اسمبلی کا اجلاس جاری ہے۔ شیعہ نصاب کی علیحدگی کے بارہ میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے تحریک التوا پیش کی ہے۔ اور وقفۂ سوالات کے لئے سود، شراب، جوا، ذرائع ابلاغِ عامہ وغیرہ سے متعلق امور نیز قادیانیت سے متعلق بعض اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ اگر اسمبلی نے اسی تحریک پہ بحث کی اجازت دی اور سوالات کے جوابات سامنے آئے تو اگلے شمارہ میں اسکی تفصیل دی جائیگی۔

(ادارہ)

بقیہ: علمی ہستیاں:

۷۵۸ھ کو گلستان (ترکستان) میں تلویح سے اور ۲۲ر شعبان ۷۶۸ھ کو شرح عقائد نسفی سے اور ۷۷۰ھ کو حاشیہ مختصر الاصول سے اور رجب ۷۸۴ھ کو مقاصد سے اور رجب ۷۸۹ھ کو خوارزم میں الارشاد سے اور اسی سال ماہ شوال میں بہ مقام سمرقند شرح المفتاح سے فارغ ہوئے ۹ر ذی قعدہ ۷۶۹ھ کو ہرات میں فتاوی حنفیہ کی اور ۷۷۲ھ کو سرخس میں مفتاح الفقہ کی تصنیف اور ۷۸۶ھ کو سرخس ہی میں تلخیص الجامع الکبیر کی تصنیف اور ربیع الآخر ۷۸۹ھ کو شرح الکشاف کی تصنیف شروع کردی۔

آخر الامر روز دوشنبہ ۲۲ر محرم الحرام کو سمرقند میں وفات پا گئے اور چہارشنبہ ۹ر جمادی الاولیٰ کو سرخس منتقل ہوگئے۔ اللھم ارفع درجاتہ وافض علینا من برکاتہ آمین یارب العالمین۔

قومی اسمبلی کے ارکان توجہ فرمائیں

صدر ادارۃ الفاروق۔ ربوہ

مظلومین ربوہ کا مراسلہ

ربوہ میں کیا ہو رہا ہے؟

مظلوم اور بے بس انسانوں کی پکار

★

خلیفہ ربوہ پرائیویٹ مجلسوں میں یہ تاثر دے رہا ہے کہ موجودہ حکومت میرے زیر اثر ہے

عظیم لیڈرو! آپ سوچیں گے کہ آخر یہ کہانی کیا ہے۔ عظیم رہنماؤ! یہ ایک ایسی درد ناک اور حسرت انگیز کہانی ہے، جو آج تک نہیں کہی گئی۔ یہ اس قدر لمبی ہے کہ صفحۂ قرطاس پر ممکن نہیں۔ بہرحال وقت کی نزاکت اور آپ کے قیمتی اوقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم صرف چند ضروری باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ ہمارے پیارے رہنماؤ! اس درد ناک کہانی کو اہالیانِ ربوہ کا نام عنوان سے پکارا جا سکتا ہے۔ جو مذہب کی مقدس نقاب پوشی کے اندر آج کے عوامی دور میں بھی سرمایہ دارانہ استحصال سے دوچار ہیں۔ ہمارا ایمان ہے جب تک اہالیانِ ربوہ کے استحصال نقاب کو چاک نہیں کر دیا جاتا۔ اس وقت تک ربوہ میں معاشی استحصال اپنی کسی نہ کسی ذلیل صورت میں غریب اور مظلوم عوام کو ڈستا رہے گا۔ اور ربوہ کے بے بس اور مفلوک الحال انسان اپنی بیچارگی پر آنسو بہاتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں گے۔

عظیم رہنماؤ! ہمیں بتاؤ کہ کیا آپ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ یقیناً نہیں۔ کیونکہ آپ ہمارے لیڈر ہیں۔ اور سچے لیڈر اپنے عوام کو دھوکہ نہیں دیا کرتے۔ آپ کو ہم نے اپنے کندھوں پر بٹھا کر قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی کرنے بھیجا ہے۔ اس لئے ہم اپیل کرتے ہیں۔ کہ خدارا ہماری حالتِ زار پر رحم کھاؤ اور ہمیں اس تحفتِ شہنشاہیت سے نجات دلاؤ جس نے سابقہ ۲۵ سال سے غریب اور مظلوم عوام کو اس قدر مضبوط مشکوں میں کس رکھا ہے۔ کہ ہلنے کی سکت تک باقی نہیں رہی۔ کس قدر پریشان کن حالات سے دوچار ہیں ہم کہ ہم آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ممکن نہیں۔ ہم آواز بلند کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہی نہیں۔ ہم ترقی کرنے کے خواہشمند ہیں۔ لیکن تمام راستے مسدود پاتے ہیں۔ اس لئے آپ کو ہماری مشکلات کا حل ڈھونڈھنا ہوگا۔ ربوہ میں کیا کیا ظلم ہوتے ہیں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے آپ سمجھتے ہوں کہ احمدی

لوگ اپنے امام کے شیدائی ہوں گے۔ لیکن اگر ظلم کی چکی میں پسی ہوئی اس مظلوم آبادی کے جگر کو چاڑ کر دیکھنا ممکن ہو۔ تو آپ کو ربوہ کا ہر ایک باشندہ دہشت اور خوف کا مجسمہ نظر آئے گا۔ اور اگر کوئی شخص اپنی عزت نفس کی پاسداری کرتے ہوئے شہری آزادی کے لفظ کو زبان پر لے آئے تو جبت پاپائیت سے زبان کھینچ لینے، جائداد ضبط کر لینے۔ ربوہ سے نکال دینے کا حکم صادر کر کے اسکو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اور اللہ کی اس وسیع زمین کو اس پر اس قدر تنگ کر دیا جاتا تھا۔ کہ وہ مقدسیت کے تخت کو نہ صرف چاٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بلکہ لاشعوری پر خوف اور دہشت کا اثر اس کی آئندہ نسل میں بھی ودیعت کر دیا جاتا ہے۔ آج ربوہ کا ایک ایک باشندہ تخت پاپائیت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن زبان پر حرف شکایت لانا موت کو دعوت کے مترادف ہے اس حقیقت کو ربوہ کا چنگیز خاں بھی بخوبی جانتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ چنگیز خان ربوہ اپنی پرائیویٹ محفلوں میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ موجودہ حکومت میرے زیر اثر ہے۔ جس کا نتیجہ لاشعوری طور پر یہ ہوا ہے۔ کہ باشندگان ربوہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ موجودہ حکومت بھی ہمارے لئے نجات دہندہ ثابت نہیں ہو سکے گی۔

عوامی لیڈرو! بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ حقوق مانگنے والے الفتح تنظیم کے کارکنان سعادت علی نعمان افضل، غلام حیدر، ناصر عتیق اور نامعلوم کتنے ایسے مظلوم افراد ہیں، جنکی ہڈیاں امور عامہ کے پروردہ غنڈوں کے ذریعے تڑوا کر ربوہ سے باہر پھینک دیا گیا۔ اور ربوہ میں ایسے افراد بھی پائے جائیں گے۔ جن کے عزیزوں کو اپنی عزت نفس کی خاطر جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ لیکن کسی کو آج تک متعلقہ حکام سے فریاد کرنے کی ہمت نہ ہو سکی اس لئے ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ:

۱۔ کیا امور عامہ کو لوگوں کی ہڈیاں توڑنے، حبس بیجا رکھنے اور اپنے پروردہ غنڈوں کے ذریعے خوف و ہراس پھیلانے کا اختیار عوامی نمائندوں نے دیا ہے۔؟

۲۔ کیا لوگوں کو ربوہ سے نکالنے، ان کی جائیداد ضبط کرنے۔ مقاطعہ کرنے اور ان کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرنے کا اختیار عوامی نمائندوں نے دیا ہے۔؟

اگر حکومت اور اسمبلی کی طرف سے کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ تو پھر بتائیے کہ ربوہ کے اس فیشن ایبل راسپوٹین کو کیا حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ لوگوں کو ربوہ سے نکلنے پر مجبور کرتے۔ ان کی جائیداد ضبط کرے۔ اپنے غنڈوں کے ذریعہ ان کی ہڈیاں تڑوانے۔ ان کا مقاطعہ کرنے۔ اور آدم کی اولاد کو اس حد تک شکست خوردہ کر دے کہ وہ اس کے پاؤں چاٹنے پر مجبور ہو جائے۔ عوام کے سچے خادمو! ہماری حالت پر رحم کھاؤ

اور ان ظلموں کے تدارک کیلئے قومی اسمبلی میں ہمارے حق میں آواز اٹھاکر ہماری حفاظت کرو۔

امور عامہ ربوہ کی گسٹاپو تنظیم | یہ ربوہ کے اندر ایک خطرناک ادارہ ہے۔ جو ہر قسم کی غنڈہ گردی اور بد معاشی کا اڈا ہے۔ یہاں ہر اس شریف آدمی کو جو تھوڑی بہت عزت نفس کا اظہار کرے، بلیک لسٹ کیا جاتا ہے۔ یہ ادارہ ایک ایسی پولیس اسٹیٹ کا روپ دھار چکا ہے۔ جہاں ملک کے اندر اور باہر تمام ضروری امور کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ پولیس اسٹیشن اور پوسٹ آفس اس کے کنٹرول میں ہیں۔ ربوہ کے پولیس اسٹیشن میں کوئی کیس اس ادارہ کی اجازت کے بغیر درج نہیں کیا جاسکتا۔ ربوہ میں لوگوں کی ڈاک وتار کا سنسر ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ امور عامہ ربوہ کے مقدس شہر کی ایک ایسی گسٹاپو تنظیم ہے جسکی شاخیں نامعلوم مقامات پر ہیں۔

مذکورہ کیفیت آبادیانِ ربوہ کی ایک عام تصویر ہے۔ اب ہم اپنے اصل مسئلہ کیطرف آتے ہیں۔ جیساکہ اوپر عرض کیا گیا ہے۔ کہ کچھ عرصہ قبل ہمارے چند ساتھی اساتذہ نے حصولِ حقوق کیلئے الفتح نام کی ایک تنظیم قائم کی تھی۔ لیکن جب چنگیز خانِ ربوہ کو امور عامہ کے جاسوسوں کے ذریعہ اس تنظیم کا علم ہو گیا۔ تو الفتح کے کارکنان کو ذلیل وخوار کرکے ربوہ سے نکال دیا گیا۔ چونکہ عوامی حکومت نے تعلیمی پالیسی کے تحت اسکولوں اور کالجوں کو قومی تحویل میں لینے کا اعلان کیا ہوا ہے۔ جس میں ایک شق یہ بھی پائی جاتی ہے کہ جو اسکول اور کالج تجارتی مقاصد نہ رکھتے ہوں گے وہ قومی تحویل سے مستثناء قرار دئیے جاسکیں گے۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ اساتذہ کو سرکاری اسکیل کے مطابق تنخواہ دی جائے اور آٹھویں جماعت تک فیس نہ لی جائے۔ جیساکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے۔ کہ ربوہ میں عام طور پر اور ہم لوگ جو اساتذہ ہیں۔ خاص طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے۔ کہ ربوہ کے اسکول وکالج سرکاری تحویل کی زد میں نہیں آئیں گے۔ کیونکہ یہ تجارتی مقاصد نہیں رکھتے لیکن ہمیں یہ صورتِ حال قبول نہیں۔ کیونکہ تجارتی مقاصد نہ رکھنے کے باوجود بھی ہم غریبوں کا استحصال ایک فراڈ کی بنیاد پر جاری رہیگا۔ تعلیمی پالیسی میں یہ بات نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ کہ قومی تحویل میں نہ آنے والے اداروں کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے اساتذہ کو سرکاری اسکیلوں کے مطابق تنخواہ دیں گے۔ اور آٹھویں جماعت تک کوئی فیس نہیں لیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ربوہ میں :

۱۔ جو تنخواہیں دی جائیں گی۔ وہ سرکاری اسکیلوں سے بہت ہی کم ہوں گی۔ لیکن دستخط سرکاری اسکیل پر ہی لئے جائیں گے۔ جو ہم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اگر شہنشاہِ ربوہ نے اس فراڈ اور بددیانتی میں کوئی سقم محسوس کیا تو وہ حکومت سے کہے گا۔ کہ ہمارے اساتذہ رضاکارانہ طور پر سرکاری اسکیلوں سے دستبردار ہونے کیلئے تیار ہیں جس پر ہم ربڑ کی مہر بننے کیلئے تیار ہوں گے۔ لیکن حقیقتاً اس کمر توڑ مہنگائی

کے زمانہ میں ہمارا رویہ اس کے برعکس ہوگا۔

۲۔ بچوں سے فیس لی جائے گی۔ لیکن نام بدل دیا جائے گا۔

۳۔ علاج و معالجہ اور رہائشی سہولیات بھی نہیں دی جائیں گی۔ لیکن ظاہراً ہم سے مثبت سبق دوہرایا جائے گا۔ جو ہم مجبوراً کریں گے۔

جس استاد یا پروفیسر کو مذکورہ شرائط قبول نہیں ہوں گی۔ اس کو امورِ عامہ کے سپرد کر دیا جائے جو اُسے ربوہ سے خارج جماعت سے خارج۔ مقاطعہ۔ جائداد ضبط کر کے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیگا۔ (جیساکہ نعمان افضل۔ ناصر عتیق۔ غلام حیدر اور سعادت علی کو اپنے حقوق کے حصول کیلئے الفتح تنظیم قائم کرنے کے الزام میں ربوہ سے خارج کر دیا گیا) اور اگر کوئی شخص حکام بالا کو اس ظلم کے تدارک کے سلسلہ میں APPROACH کرنے کی جرأت کرے گا۔ تو امورِ عامہ کے غنڈے اسے ایسا ٹھکانے لگائیں گے۔ کہ آئندہ اسکی اولاد بھی ایسا سوچنے کی جرأت نہیں کر سکے گی۔ اسلئے ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے "الفاروق" تنظیم قائم کی ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنے عظیم لیڈروں سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ ہمارے حقوق کی بحالی کے لئے اسمبلی میں آواز اٹھائیں۔ تاکہ ہم بھی آزاد پاکستانیوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ:

۱۔ ربوہ کے تمام اسکول و کالج قومی تحویل میں لئے جائیں۔

۲۔ امورِ عامہ کے محکمہ کو توڑ دیا جائے۔

۳۔ دارالقضاء کے ادارہ کو جو بے انصافی کا اڈا بن چکا ہے، توڑ دیا جائے۔

۴۔ پولیس اسٹیشن اور پوسٹ آفس کو امورِ عامہ کے کنٹرول سے آزاد کروایا جائے۔

۵۔ ربوہ کے سیکرٹریٹ کے ملازمین کو بھی مزدور پالیسی کے تحت تنخواہیں دلوائی جائیں۔

۶۔ ربوہ سے عوام کا اخراج اور مقاطعہ کا سلسلہ حکماً فوراً بند کروایا جائے۔

آنریبل لیڈرو اگر مذکورہ بالا اقدامات کر لئے گئے۔ تو خدا کی قسم ربوہ کا تخت شاہی دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ اور اس طرح ربوہ میں مظلوم عوام کا استحصال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناپید ہو جائے گا۔ اور اس طرح پاکستان کی ساری سرزمین حقیقی آزادی کے ایک ایسے سورج سے منور ہو جائے گی۔ جہاں سیاسی، معاشی اور حقیقی مذہبی آزادی کا دور دورہ ہوگا۔ (حمید بیگ صدر امارۃ الفاروق۔ ربوہ)

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

حضرت ضیاء المشائخ مولانا محمد ابراہیم جان المجددی
کابل (افغانستان)

الحق کے سوالنامہ کا پیشِ نظر جواب افغانستان اور عالم اسلام کے برگزیدہ شخصیت مجاہد جلیل عارف وقت حضرت نور المشائخ (ملا شور بازار مرحوم) مجددی قدس سرہ العزیز کے جانشین حضرت ضیاء المشائخ مولانا محمد ابراہیم جان المجددی دامت برکاتہم کا لکھا ہوا ہے موصوف اپنے اولو العزم والد بزرگوار کے صدقۂ جاریہ اور خاندان مجددیہ کے گل سرسبد ہیں۔ شریعت و طریقت کے جامع، منبع رشد و ہدایت اور علم و عرفان کے مینار ہیں زمانہ کے حالات اور تقاضوں کی روشنی میں عالم اسلام اور اسلام کے مسائل پر گہری نظر اور پرسوز دل رکھتے ہیں۔ مجلس میں بلا کی تاثیر ہے۔ الغرض آپ کی خانقاہ قلعہ جواد آج بھی مغرب زدہ کابل میں روحانیت اور سکون کا ایک جزیرہ لگتا ہے۔ پچھلے سال سفرِ کابل میں اس ناچیز کے ساتھ حضرت موصوف اور ان کے صاحبزادگان اور پورے خاندان نے جس بے پناہ شفقت اور محبت کا سلوک فرمایا اور تقریباً ایک ہفتہ قیام افغانستان کے دوران ہر جگہ جن عنایتوں سے نوازا گیا اس کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ آج کی فرصت میں ہم حضرت موصوف کے گرانمایہ خیالات پیش کرتے ہیں۔ (سمیع الحق)

فضیلت پناہ دانشمند گرامی مولوی سمیع الحق صاحب، صاحبِ امتیاز جریدۂ الحق۔

مکتوب محبت اسلوب مواصلت نمود بدواً توضیح میکنم کہ سبب تاخیر جواب آں بود کہ فقیر بطرف ولایت غزنہ و بعض کارات مدرسہ عالی نور المدارس فاروقی سفر نمودہ بودم۔ در نامۂ گرامی پرسش چند نمودہ

بودند میدانم که وجدان سلیم شما از حسن ظن که بمن دارید این پرسش ها را از قریحه بقلم و از قلم بقرطاس حواله نموده اند اما حیات پر شور و بی انجام من قیمت آنرا ندارد که نظریات خویش را نسبت تعین بعض شقوق جامع علمی و با شخصیت های برجسته عرفانی توضیح دهم و یا از نقطه نگاه حیات اجتماعی عالم اسلام از حیث تاثیر سلسله ثور و تاستی که اذهان و افهام را تربیه و تنبیه می نماید اظهار نظر به نمایم چون سوال فرموده اند بجواب میپردازم اول در حیات خوشگوار و باسعادت که در دوحهٔ عالم علم سیری نموده و می نمایم و در حیات برزخ نیز از آن بعون الله تعالی بران حسن خاتمه استفاده خواهم نمود طمانیت قلبی و تقویهٔ وجدان مرا که بار می آورد همانا در فن تفسیر قرآن عظیم الشان ابن کثیر و معالم التنزیل است و در سلسله حدیث علاقهٔ من با بخاری و مسلم و مستدرک حاکم نیشاپوری بوده و در فقه هدایه و فتح القدیر که در سلسله فقه یا حقوق اسلامی بدان من زیاده تر دل پسند بوده و در معانی مطول را با تلخیص؛ پسند دارم در تشریع اسلامی توضیح - و از مؤلفات جدید تاریخ تشریع اسلامی را که ــ نغز مؤلف صاحب قدر مصری جمع نموده اند مرا محظوظ مینماید در تصوف که دارای دو مکتب است - اول وجودی عشق و علاقه با "فصوص الحکم" ابن عربی و مثنوی مولانا بلخی رومی دارم در مکتب شهودی تلمیذ مکتوبات امام همام مجدد الف ثانی میباشم و بدان افتخار مینمایم - در تاریخ علامه ابن خلدون را بسیار دوست داشته و الحق که درین فن استاد کامل می باشد، و در ادب عربی ابن مقفع و امام بصیری را در متقدمین امتیاز می دهم و در طبقه حالیه مرحوم شوقی بیگ مصری را ستائش می کنم و در ادب فارسی با سعدی و نظامی و جامی هروی و اقبال لاهوری و عرفی را می پسندم و تخصیص خاص بمقام ادبی مولانا عبدالقادر بیدل قائلم در کلام و فلسفه حجت الاسلام غزالی و علامه ابن رشد فلسفی را با کمال احترام می ستائم البته علم بردار ثقافت اسلامی در فلسفه و کلام بوده اند هر کدام ازین شهسواران میدان با صفای علم و دانش شان خاص داشته و در فنون مختصه خود ها توانستند که از موضوع علم و تعریف علم و تبصره های بارعه در آن علوم و اجتهادیات جامعه و در آن فنون با توان کامل و تدبر علمی که شامل تمام نکات رسیده - علمی بوده معرفت را دارا بودند و از منطق رسائی و دانائی کار گرفته اند رحمت خاص خداوند جل شانه بر روان این برگزیده گان معارف اسلامی با خصوصیات این ذوات عالی مرتبت آنست که هر فن را چنان شرح و بسط داده اند که تمام طبقات علمی امروزه بمقام علمی شان معترف بوده به آواز بلند می گویند هر فن را که تخصیص داده اند کما هو آنرا کمیتاً و کیفیتاً در رشته تصنیف تالیف، آورده اند و از اصل موضوع خارج نشده تحقیقات بلند و تدقیقات ارجمند شان در همان موضوع که فرموده اند تماماً متکی بر قوائم علمی بوده جزاه الله عنا و عن سائر اهل العلم خیر الجزاء

دوم در حصه جرائد و مجلات است که طبعاً در آن از چندین جنبهٔ اجتماعی بحث می شود مثل سیاست و اقتصاد

واخلاق وتحریک مسائل که احساسات یک ملت را بطور می آورد ان را اگر در حیات بگویم بعید نیست
ودر دنیا امروزه اسلامی بیشتر دلچسپی من بجریده المسلمون که از قاہرہ نشر می شود بوده وسپس روزنامه الندوه
عربیه را قابل قدر می دانم واز مجله ہا دار العلوم دیوبند ومجله پیام حق که از کابل نشر می شود آن را مفید می دانم ومجله الحق
راکه در لسان ادبی اردو خدمت در شعوق حیات اجتماعی اسلامی وسیاسی اسلامی می نماید می ستایم منکه تخصیص برائے
این روزنامه ها یا مجلات قائل شده ام حدف من تنها وتنها اینست که نشرات آنها در جبهه ہائے سیاسی واجتماعی
واقتصادی ودر حیات از کلتور وایدلوجی اسلام مستقلاً پیروی نموده دولت خانگی خود را بنسل وجبیل آینده
اسلامی معرفی می نماید. زیرا امروز فرض تحسین است تا ابنائے مسلمان از استقلال علمی وسیاسی واقتصادی
به اساس یک منطق قوی واقف شوند کلتور اسلام در تمام شعوق حیاته بنی نوع انسانی مستقل بوده ودگاهی از
مکتب ہائے امپریزم ویا تیزیالزم پیروی نموده حقوق سیاسی، حقوق اقتصادی، حقوق ملی حقوق جغرافیائی، ہمه
را بطور خاص ومنطق قوی واستقلال علمی بیان می نماید که بہر انسان دانا وصاحب ضمیر روشن معلوم وهویدا است.

سوم مسئله که مربوط به حیات شخص من است، نسبت به حوزہ ہائے علمی است. البته من علاقه
زیاد بدار العلوم عربیه کابل وبدرسگاه خانقاه عالیه مجددی دارم۔

عمریه بہرور وخطہائے نیک ظاہراً وباطناً حاصل نموده ام اگر بر تن من زبان شود هر موئے: دیک شکردی
از ہر زد نتوانم کرد. خاصتاً ذره نوازی وتربیه باطنی وظاہری که از حضور مقدس حضرة شیخ الاسلام مولانا ومرشدنا
نور المشائخ قدس سرہٗ که پیشوائے ظاہری وباطنی من است. بدست آورده ام زبان قاصر من وقلب کاسر من
نمی تواند شکریه آن احسان را ادا نماید بلے می توانم که بگویم بخدا رہنمائی من است ودر طریق علم ومعرفت استاد
وپیشوائے برگزیده من بلے که من او را مریدم او یعنی ہست پیر من۔

دیگر استاد بزرگوارم شیخ الحدیث والتفسیر مولانا یار محمد صاحب وردکی رحمة الله علیه که صدر دار العلوم
عربیه کابل بودند ودر حصه تفسیر موضح الفرقان بزبان پشتو حصه بزرگ داشتند گاہے مقام علمی شان را فراموش
نمی توانم بہترین مقامات آخرت را برائے آن استاد بزرگوار طالبم۔

چہارم۔ به عقیده من امروز بہترین نظریه برائے ارتقائے ملت اسلامی آنست که ملت اسلام
خاصتاً طبقه جوان باید سرمایه کامل از ثقافت وکلتور اسلامی بدست آرند واز انکشافات علمی حدیثه از طریق
تکنالوژی عصری باید کاملاً واقف باشند البته وظیفه مہم علما ورہنمایان اسلامی امروز آنست تا اساسات
علمی وثقافتی اسلامی بر اساس منطق علمی امروزه تدوین نموده بر این تعلیم ابنائے امروزه اسلامی بہترین ارمغان
اسلامی را تقدیم کنند وباید این تدوین در تمام شعوق علمی اسلامی متکی بر اصولات قولی معنوی معقول ومنقول بوده

درعین حال مراعات حسن انتشار و طرز تفہیم موضوع علمی براساس کیفیات علمی باشد کہ زیادہ تر بر بدیہیات و مشاہدات متکی بودہ و دارِ دلائل باشد کہ آن دلائل را انکار متعذر و عقول سالم عقلاً و علماً قبول نمایند و نیز در مسائل کہ قرآن عظیم الشان در حصہ تکوین و کیفیات ، کائنات سفلی و علوی ارشاد می نماید از امعان نظر صاحب کارگرفتہ صورت تدوین آنرا در یک فارمول جامع علمی ترتیب نمودہ بعالم ، علم و دانش عرضہ نمایند البتہ بعقیدہ من بودا در این مرحلہ یک میتنگ بزرگ علمائے موجودہ اسلامی ضرور است درین مورد کہ امروز احتیاج بزرگ بدان عالم اسلام وارد حرکت مثبت علمی بوجود آید من یقین دارم اگر این سلسلہ از یک توافق سالم و صداقت کامل انجام شود مشکلات امروزی عالم اسلام کہ از حیث بعض اسرار خاصہ علمی بوجود آمدہ و در دنیا کنونی ملت اسلام بحیث یک ملت ذی علم و معرفت کہ سزاوار مقام مسلمین است اثبات وجود خواہند نمود۔

این بود نظریہ من کہ بجناب شما مختصراً توضیح نمودم ——— ع گر بگویم شرح این بیحد شود

(فقیر محمد ابراہیم المجددی ابن عمرؒ)

★

ترجمہ | محبت نامہ نے نقشۂ وصال سامنے کیا۔ سب سے پہلے تاخیر جواب کا سبب واضح کر دینا مناسب ہے۔ فقیر مدرسہ عالیہ نور المدارس فاروقی (واقع شہر غزنی) کے بعض اہم کاموں کے لئے غزنی گیا تھا۔ آپ نے مکتوب گرامی میں اپنے وجدانِ سلیم کے پیش نظر مجھ پر حسنِ ظن فرماتے ہوئے چند سوالات کو ذہن سے بوساطتِ قلم زیبِ قرطاس فرمائے ہیں۔

۱۔ میری پرشور اور بے انجام زندگی اس قابل نہیں کہ اپنے نظریات کو بعض علمی زاویوں یا ممتاز شخصیتوں میں متعارف کرانے کی جسارت کروں۔ یا عالمِ اسلام کی اجتماعی زندگی کے گہرے تاثرات کے نقطۂ نگاہ سے جو لوگوں کے اذہان و افہام کی تربیت کرتی ہیں اپنے نظریہ کی نشاندہی کر سکوں۔ تاہم حسب تعمیل حکم سوالات کے جوابات تحریر کر رہا ہوں۔ اولاً یہ کہ خوشگوار اور باسعادت زندگی میں جو گلستانِ عالم میں اب بڑھاپے کی حالت تک پہنچا دیا ہے۔ اور جیسے بفضلِ ایزدی حسن خاتمہ اور برزخی زندگی کو گزارنے کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

فنِ تفسیر میں ابن کثیر اور معالم التنزیل نے اطمینانِ قلب اور تقویتِ وجدان کے ثمرات بخشے اور علم حدیث میں بخاری شریف اور مسلم شریف۔ امام حاکم نیشاپوری کی مستدرک سے پوری وابستگی اور تعلق ہے۔ اور علم فقہ میں ہدایہ۔ فتح القدیر، فقاہت اور اسلامی حقوق کے اعتبار سے سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ اور علم معانی میں مطول کو تلخیص کے ساتھ پسند کرتا ہوں اور اصول فقہ

میں جو تشریع اسلامی کا فن ہے اس میں توضیح تلویح اور جدید تالیفات میں تاریخ تشریع اسلامی نے مجھے محظوظ کیا ہے۔ جسے مصر کے تین مصنفوں نے مل کر تصنیف کیا ہے۔ اور علم تصوف جس میں دو مکتب ہیں۔ اوّل مکتب "وجودی عشق" میں ابن العربی کے فصوص الحکم اور مولانا ئے روم کی مثنوی سے علاقہ رکھتا ہوں اور دوسرا مکتب "شہودی" میں امام ربّانی مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات گرامیہ کا شاگرد ہوں۔ اور ان سے شرف تلمذ پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ اور فنِ تاریخ میں علامہ ابنِ خلدون کی تاریخ سے بہت ہی زیادہ محبت ہے۔ اور حق بات یہی ہے کہ یہ کتاب فنِ تاریخ میں استادِ کامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ادب عربی میں متقدمین میں سے ابن مقفع اور امام بوصیریؒ کو تمغۂ امتیاز دیتا ہوں اور دورِ حاضر میں مرحوم شوقی بیگ مصری کا ثناخواں ہوں اور ادبِ فارسی میں سعدی نظامی، جامی ہروی، واقف لاہوری اور عرفی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور ادبی مقام میں خصوصی طور پر مولانا عبدالقادر بیدل کا معترف ہوں۔ اور علم کلام و فلسفہ میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور علامہ ابن رشد فلسفی کو پورے احترام کے ساتھ حق مدح سرائی اور خراجِ تحسین ادا کرتا ہوں۔

یقیناً یہ حضرات اسلامی ثقافت کے فلسفہ و کلام کے علمبردار تھے۔ اور درحقیقت یہ تمام اکابر علمی میدان کے شہسواروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی علم و دانش کی روشنی میں اور اپنے خصوصی علوم و فنون جو ان کو ورثہ میں نصیب ہوئے تھے۔ (جس میں پوری دسترس اور کامل عبور رکھتے تھے۔) کو بیان موضوع اور تعریف اور بلندپایہ تبصروں اور مکمل و جامع اجتہادات سے آراستہ کیا ہے۔ اور اپنے ان قلموں میں پوری توانائی اور علمی تدبر و فراست (جو جملہ نکات پر حاوی ہے) کے اعتبار سے "دارا" تھے۔

خداوند قدوس جل شانہٗ معارفِ اسلامی کے ان چیدہ شخصیتوں کے ارواحِ طیبہ پر اپنی خصوصی رحمتوں کو نازل فرمائے ان بلندپایہ حضرات کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے ہر فن کی ایسی جامع تشریح کی ہے۔ کہ تمام علمی طبقے ان کے علمی مقام و منزلت کے معترف بآوازِ بلند یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان نیک سیرت ہستیوں نے ہر اس فن کو (جسے ان کو خصوصی لگاؤ تھا۔) کماحقہٗ پورے کم و کیف کے ساتھ تصنیف و تالیف کی لڑی میں پرو کر اصلِ موضوع سے کبھی ادھر ادھر نہ ہوئے۔ اور موضوع سے وابستہ جو بلندپایہ تحقیقات و ترقیات کو بیان کیا ہے وہ علمی براہین اور بنیادوں پر مستحکم ہے۔ جزا اللّٰہ عنا وعن سائر اھل العلم خیر الجزاء۔

۲۔ رسائل و مجلات کے سلسلہ میں وہ جریدے اور رسالے پسند ہیں جن میں سیاست، اقتصادیات اخلاق اور ایسے مسائل کی تحریک جو وحدت ملی کے احساسات کو فروغ دیں۔ اگر ان کو "روحیات" سے

پکاروں تو یہ لقب بے جا نہ ہوگا۔ اور موجودہ اسلامی دور میں زیادہ تر دلچسپی "المسلمون" نامی رسالہ سے ہے۔ جو قاہرہ سے شائع ہوتا ہے۔ بعد ازاں عربی روزنامہ "الندوہ" کو قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ اور ماہنامہ دارالعلوم جو دیوبند سے شائع ہوتا ہے۔ نیز "پیامِ حق" جو کابل سے نشر ہوتا ہے۔ اور ماہنامہ الحق کی ستائش کر رہا ہوں (جو اردو کی ادبی زبان میں ملت کی اجتماعی، سیاسی شعبہائے زندگی میں اسلامی اقدار کی خدمت کر رہا ہے۔)

میں ان رسائل وجرائد کی تعریف محض اس لئے کرتا ہوں کہ میرا مطمحِ نظر صرف یہی ہے کہ ہر قسم کے مجلات کی نشر واشاعت سے سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور کلچر کی روح و نظریات وافکار میں اسلامی روح پیدا ہو، فرزندانِ ملتِ اسلامیہ کو اسلامی روایات واقدار سے متعارف کرے کیونکہ موجودہ دور میں سب سے اہم اوّلین فریضہ یہی ہے کہ مسلمان پود علمی، سیاسی، اقتصادی مسائل سے قوی دلائل کی بنیاد پر مسلح ہو کر اسلامی کلچر کو افرادِ انسانی کی زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کریں اور سکولوں اور کالجوں میں امپریلیزم اور ماتریالزم (مادہ پرستی) کے پیروکار نہ بنیں۔ سیاسی، اقتصادی، ملی اور جغرافیائی حقوق کو ایک خصوصی نہج، موثر بیان اور علمی سنجیدگی سے واشگاف کریں جسے ہر ایک دانشمند اور روشن ضمیر انسان سمجھتا ہے۔

۳۔ تیسرا مسئلہ جو میری زندگی سے وابستہ ہے۔ علمی چشموں سے سیرابی کی نسبت یہ ہے کہ میرا سب سے زیادہ تعلق دارالعلوم عربیہ کابل اور خانقاہ عالیہ مجددیہ عمریہ کی درسگاہ سے ہے۔ میرا علمی سرمایہ علم ومعرفت کے ان دو مرکزوں سے مستفاد ہے۔ باطنی حالات اور ذوقی کیفیات بھی عرفان کے اس مقدس مرکز خانقاہ مجددی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اگر میرے جسم کے تمام بال زبان بن جائیں تو ان مراکز کے لامتناہی عنایات واحسانات کا حقِ سپاس وتشکر ادا نہیں کر سکتے خاصکر باطنی وظاہری اصلاح وتربیت جو حضورِ مقدس حضرت شیخ الاسلام مولانا ومرشدنا نور المشائخ قدس سرہ (جو علوم ظاہری وباطنی میں میرا آقا اور پیشوا ہے) کی بدولت مجھے حاصل ہے۔

میرا قلب ودماغ اور زبان یکسر اس قابل نہیں کہ ان کے بے پایاں نوازشات کا سپاس ادا کر سکوں۔

ہاں ——— !

مالا یدرک کلہ لایترک کلہ کے مطابق مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ وہ علم ومعرفت میں میرے استاد اور پیشوا ہیں۔ میں ان کا مرید اور وہ میرے مرشد وآقا ہیں۔ میرے دوسرے استاد بزرگوار شیخ الحدیث والتفسیر مولانا یار محمد صاحب وردگی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دارالعلوم عربیہ کابل کے صدر مدرس تھے۔

اور تفسیر موضح القرآن (جو پشتو زبان میں لکھی گئی ہے) میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں ان کے علمی مقام کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے بہترین مدارج اور بلند مقامات پر فائز فرمادے۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے، میرے عقیدہ میں آج ملتِ اسلامیہ کی ترقی و بقا کے لئے بہترین نظریہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کو اسلامی کلچر اور ثقافت کے مکمل سرمایہ سے بہرہ ور کر دیا جائے اور جدید علمی انکشافات، موجودہ دور کی ٹکنالوجی سے کامل طور پر شناسائی حاصل کرائی جائے۔

البتہ آج علماء کرام اور رہنمایانِ اسلام کا اہم وظیفہ یہ ہے۔ کہ ثقافتِ اسلامی کو موجودہ فلسفہ کی بنیاد پر مدون کرکے عصر حاضر کے نوجوانوں کو ارمغانِ اسلامی پیش کریں۔ اور اس امر کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ اس نئے تدوین میں علومِ اسلامیہ کے جملہ شعوق ٹھوس اصول اور عقلی نقلی دلائل پر مبنی ہوں جنہیں روشن فکر، سلیم الطبع حضرات قبول کریں۔ اور ان جدید کتب کی عبارت میں روانی، شستگی ہو۔ لہجہ عام فہم ہو، بدیہیات اور مشاہدات پر مبنی ہوں۔ اور ان میں ایسے دلائل سے مسائل کو ثابت کیا گیا ہو۔ جن دلائل کو عقلِ سلیم رکھنے والے حضرات از روئے عقل و دانش قبول کریں۔ نیز ان مسائل کو بھی ایک جامع فارمولے کے تحت جمع کریں جن کو قرآنِ مجید اور روایات میں تکوینی اور عالم سفلی، علوی کی کیفیات کو صراحۃً یا اشارۃً بیان کر دیا گیا ہے۔

البتہ میرے عقیدہ اور نظریہ میں یہ بات سب سے پہلے ضروری ہے۔ کہ اس سلسلہ میں اکابر علماءِ اسلام کا ایک اجتماع منعقد ہو جائے۔ جسکی علمی حرکت اور نشاط پیدا کرانے کے لحاظ سے بے حد ضرورت ہے۔ اگر پورے خلوص اور صداقت سے یہ کام شروع ہو سکے تو عالم اسلام کو علمی و فکری پیش آمدہ جدید مسائل و مشکلات کا جواب دیا جا سکے گا۔ اور ملتِ اسلامیہ کو وہ علمی اور عرفانی مقام مل سکتا ہے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ یہ میرے خیالات تھے۔ جو مختصراً جناب کی خدمت میں عرض کئے گئے۔

ع گر بگویم شرح ایں بے حد شود

■■

بقیہ: عربی زبان:

لیکن ان پر عربی کی بجائے اردو مسلط کی گئی۔ جس روز عربی کو چھوڑ کر اردو کو قومی اتحاد کا ذریعہ بنایا گیا۔ اسی روز بنگلہ دیش کی بنیاد پڑی۔ مغربی پاکستان میں بھی علاقائی زبانوں کے حامی عربی کے لئے برضا و رغبت تیار ہیں۔ ابھی وقت ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔

عالمِ عرب اور عالمِ اسلام سے ارتباط کے لئے عربی کی جو اہمیت ہے۔ اس سے بھی آپ اور مولانا ہزاروی بخوبی واقف ہیں۔ عربی کو اس کا مقام دلانا جمعیۃ کا آپ کا اور مولانا ہزاروی کا وعدہ ہے۔ الحر حر ما وعد۔ محض انتخابی وعدہ نہیں بلکہ دینی فرض ہے۔ والسلام۔

علامہ شمس الحق افغانی

سیرتِ نبوی اور مستشرقین

قسط ۴

۳۔ سوم غلط فہمی اس حدیث کے عدم فہم سے واقع ہوئی جس میں ارشاد ہے: امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا دماءھم واموالھم: میں مامور ہوں کہ لوگوں سے لڑوں اس وقت تک کہ توحید کا اعتراف کرے جب یہ اعتراف کرے تو اسکی جان و مال محفوظ ہوئے۔ اس سے مستشرقین نے یہ غلط نظریہ جمایا کہ مسلمان تلوار ہاتھ میں لے کر گھماتا ہے۔ اور کافر سے یہ کہتا ہے کہ اسلام لاؤ۔ ورنہ تمہارے لئے تلوار ہے۔ ہم آیات و حدیث سے اسکی تردید کر چکے ہیں۔ حدیث مذکور کا تعلق میدانِ جنگ سے ہے کہ جب عین دورانِ جنگ میں کوئی کافر لا الٰہ الا اللّٰہ۔ کہہ دے تو رک جاؤ اور اس سے مت لڑو۔ اگرچہ جان بچانے کیلئے کہے اور دل سے نہ کہے، حضرت اسامہؓ نے جب ایک شخص کے قتل کے متعلق یہ عذر پیش کیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے اسکا دل چیرا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مستشرقین کا یہ متعصبانہ بلکہ مجنونانہ الزام درست ہوتا تو بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے تو ان سے یہ کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔ اور قرآن نے یہ حکم کیوں نازل کیا۔ کہ فاما منّاً بعد و اما فداءً یعنی قیدیوں پر احسان رکھ کر مفت چھوڑ دو یا فدیہ لیکر چھوڑ دو یہ نہ کہا گیا کہ اسلام یا تلوار۔

فتح مکہ میں جو تقریباً دس ہزار کفار قیدی پیش ہوئے تو یہ فرمایا گیا، لا تثریب علیکم الیوم۔ میں تمہارے اعمال پر تم کو ملامت بھی نہیں کرتا۔ بلکہ تم آزاد ہو اور یہ کیوں نہ کہا گیا۔ یا اسلام یا تلوار۔ ثمامہ رئیس یمامہ جب قید ہو کر آیا تو اسکو رہا کیا گیا۔ اس نے خود غسل کر کے اسلام لایا اور حضورؐ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ اسلام یا تلوار۔ خدا کا یہ ارشاد و ان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ (انفال) اگر کفار کا محارب فریق صلح کیلئے

جھک جائے تو تو بھی جھک جا۔ اور یہ کیوں نہ فرمایا گیا کہ اسلام یا تلوار۔

لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروا الیھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ تم کو اللہ ان کفار کے متعلق جو تم سے دین کی وجہ سے نہیں لڑے اور نہ تمکو ملک سے نکالا اس بات سے نہیں روکتا کہ ان کفار سے تم احسان کرو اور ان سے منصفانہ سلوک کرو اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کافروں سے ایسا کیوں نہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ ورنہ تلوار ہے۔ سورۂ نساء میں خدا کا یہ حکم قرآنی ہے۔ فان اعتزلوکم ولم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا۔ اگر وہ کفار تم سے کنارہ کریں پھر نہ لڑیں اور وہ تمہارے سامنے صلح کا پیغام ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہ دی ہے۔ قرآن حکیم اس قسم کے مضامین سے پر ہے جس سے یورپ کے اس مجنونانہ متعصبانہ غلط الزام کی تردید ہوتی ہے۔ عاقل کے لئے اس قدر کافی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یورپ والے اسلام کے ان احکام کو دیکھ کر اس کا احسان مانتے کہ اسلام کے رحیمانہ اور مہذبانہ قانون میں عین جنگ کے شعلوں کے دوران دشمنوں کی یہ رعایتیں دی گئی ہیں جنکی کسی مذہب اور خاصکر بائبل میں نظیر نہیں مثلاً دوران جنگ سول آبادی میں بوڑھی عورتیں تارک الدنیا درویش افراد پر ہاتھ اٹھانا اور ان سے لڑنا منع ہے۔ عین جنگ میں صلح کی پیشکش اگر دشمن کرے تو جنگ رک جائے گی۔ آتشی آلات سے مارنا منع ہے۔ لا تعذبوا بعذاب اللہ۔ آگ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو۔

۴۔ چہارم سبب جہاد اسلامی کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں مسیحی یورپ کی غلط فہمی ہے جہاد عربی لفظ ہے جس کے معنی لغۃً کسی مقصد کیلئے جدوجہد کرنے کے ہیں۔ اسلام قرآن اور سنت کی اصطلاح میں مالی و جانی و قولی جدوجہد کا نام جو سبیل اللہ میں ہو سبیل النفس یا سبیل القوم یا سبیل الوطن کی آمیزش سے پاک ہو جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت نے جہاد کو اکثر مواضع میں جو ذکر کیا ہے۔ تو سبیل اللہ کے ساتھ ملا کر کیا ہے۔ وجاھدوا فی سبیل اللہ حق جہادہ پوری کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسے اس کا تقاضا ہے۔ ابوداؤد کی حدیث ہے۔ وجاھدوا بانفسکم و اموالکم والسنتکم۔ خدا کی راہ میں نفس مال اور زبان سے کوشش کرو۔ اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ سبیل اللہ کیا چیز ہے وہ نام ہے اللہ کے اس بین الاقوامی اور انسانی قانون عادلانہ کا ہے۔ جو خالص انصاف پر مبنی ہے اور جس میں کسی قوم اور ملک اور خاص نسل اور رنگ والے لوگوں کیطرف داری نہیں اور ہر جانبداری سے پاک ہے۔ اور سب عالم کے لئے یکساں مفید ہے۔

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین۔ ہم نے آپ کو وہ قانون دے کر بھیجا جو کل عالم کیلئے رحمت ہے۔ الحمد للہ الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا۔ (فرقان) ساری تعریف اس خدا کو ہے جس نے قرآن اتارا اپنے خاص بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تاکہ تمام عالم کو ظلم کے نتائج سے ڈرائے۔ یہی انسانی عمومی مفاد مقصد جہاد ہے۔ اللہ نے جہاد کا مقصد یہ بتلایا ہے۔ وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ وکلمۃ اللہ ھی العلیا۔ جہاد کے ذریعہ اللہ نے کافرانہ قانون کو پست کر دیا۔ اور اللہ کا قانون عادلانہ بلندی کے لائق ہے۔ حضور علیہ السلام والصلوٰۃ نے جہاد کرنے والے کی یہ تعریف کی ہے۔ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔ جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا قانون انصاف بلند و بالا رہے۔ ظاہر ہے ایسے عالمگیر قانون انصاف جس میں اللہ انسان اور حیوانات تک کے حقوق محفوظ ہوں۔ اسکی آزادی کے ساتھ اشاعت کی راہ میں ظالمانہ قوتیں حائل ہو جاتی ہیں۔ اور اشاعت حق کی آزادی سلب کرتی ہے۔ ان کو دور کرنے کی صورت میں حق و باطل عدل و ظلم کا معرکہ کارزار بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اور قتال تک نوبت پہنچتی ہے۔ ایسی صورت میں کبھی اہل باطل حق کچلنے کیلئے حملہ کرتے ہیں۔ عہد نبوی کے غزوات میں اکثر ایسا ہوا۔ بدر، احد، خندق، حنین اسکی مثالیں ہیں۔ کبھی اہل باطل حق کی تباہی کے لئے تیاری کرتے ہیں۔ تو اہل حق کو قبل از وقت مدافعت کرنی پڑتی ہے۔ غزوہ موتہ و تبوک میں ایسا ہوا۔ اور کبھی راہ حق کی اشاعت کی رکاوٹ پیدا کرنے والی طاقتوں کو راہ سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ تاکہ حق کو آزادی نصیب ہو۔ ایسی صورت میں ابتدائی سرکوبی زیادہ موثر ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے سرایا میں اکثر ایسا ہوا۔ اس کو آپ ابتدائی اقدام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ لیکن مقصد وہی ہے جو عرض کیا گیا۔

سورۃ انفال کے آخر میں ہے: والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر۔ سب کفار قومیں اللہ کے قانون عدل کے خلاف متحدہ محاذ کی صورت میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اگر تم حق و عدل الٰہی کیلئے جہاد نہ کرو گے۔ تو ساری زمین الٰہی حقوق کی بربادی یعنی فتنہ کی صورت میں پڑی ہو گی۔ اور عقیدہ و عمل کی شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔ انسانی حقوق ظلم کے ہاتھوں پامال ہو کر بڑا فساد برپا ہو گا۔ یہ فرق ہے دنیوی جنگوں میں اور جہاد میں۔ دنیوی جنگ تخریبی عمل ہے۔ جیسے ڈاکو کسی کا ہاتھ کاٹ دیتا ہے۔ اور جہاد اصلاحی عمل ہے۔ جیسے سرجن زہریلے پھوڑے کی وجہ سے مریض کا ہاتھ کاٹتا ہے۔ کہ باقی بدن محفوظ ہو جائے۔ افسوس کہ مستشرقین نے مسیحی اقوام کی تباہ کن آلات جنگ اور ایٹمی

آلات سے گذشتہ دو جنگوں میں اور موجودہ وقت میں ویٹ کانگ میں جو بم برسائے اور انسان حیوانات، نباتات عمارات تک کو تباہ کر دیا۔ اور وہ بھی صرف شیطانی مقصد کیلئے کہ قومی مفاد یا برتری ثابت ہو۔ اس پر اعتراض سے خاموش ہیں۔ اگر اعتراض ہے تو اسلام کے اصلاحی معمولی عمل پر جس میں انسانیت کا عظیم تر مقصود پنہاں ہے۔ اگر اسلام میں دینی جبریت ہوتی تو ہزار سال یا اس سے زیادہ عرصہ تک عراق، مصر، شام اور ہندوستان میں اسلام نے حکومت کی۔ لیکن چاروں ملک میں بدستور عیسائی۔ یہودی۔ ہندو موجود رہے اور بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کوئی مسلمان تلوار لیکر اٹھا ہو اور اس نے کسی یہودی عیسائی یا ہندو سے کہا ہو کہ یا اسلام یا تلوار۔

برخلاف عیسائیوں کے سپین اور سسلی میں مسلمانوں کی آٹھ سو سال حکومت رہی، لیکن جب مسیحی اقتدار آیا۔ تو انہوں نے مسلمانوں کا نام و نشان بلکہ قبروں تک مٹا دیا۔

یہی حال موجودہ ہندوستان کا ہے۔ کہ انہوں نے اقتدار کے چند سالوں میں بیس لاکھ مسلمان قتل کئے۔ ایک کروڑ جلاوطن کئے، اور ہر روز ان کے فناء کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن پاکستان افغانستان ایران میں کسی ہندو یا سکھ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ اس دورِ انحطاط میں بھی اسلامی تعلیم کا اثر ہے۔ جو مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

اب ہم بائبل سے جبر و اکراہ اور مذہبی جنگوں کے متعلق مختصر حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ جہاد اسلام سے مختص نہیں بلکہ بائبل کا جہاد اسلام کے جہاد سے سخت ہے۔

۱۔ تورات کتاب استثنا باب ۲۰: حضرت موسیٰ کو خطاب ہے کہ جب تم کسی شہر میں داخل ہو یا اس کے قریب ہو تو ان کو صلح کی طرف بلاؤ اگر قبول کر دے تو اس کے سب رہنے والے تمہارے غلام ہوں گے۔ تم کو جزیہ دیں گے۔ اور اگر صلح قبول نہ کریں تو تمام مردوں کو قتل کرو اور عورتوں و بچوں کو اور مویشیوں کو اور جو کچھ شہر میں ہے۔ خاص اپنے لئے غنیمت بناؤ۔

۲۔ تورات کی کتاب عدد باب ۳۳ میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے جب تم اردن سے گذرو اور تم کنعان میں داخل ہو تو وہاں کے تمام باشندوں کو ہلاک کرو۔ اور تباہ کرو ان کی مسجدوں کو۔

۳۔ تورات کتاب استثنا باب ۷: جس شہر پہ جہاد کرو تو مارو ان کو یہاں تک کہ ان میں سے کوئی نہ بچے۔ اور ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرو اور نہ ان پر رحم کرو۔ اسی طرح جہاد یوسع باب ۱۰ وصفر سموئیل باب ۱۲ و جہاد داؤد باب مذکور میں ہے: ان کو قینچی اور چھریوں سے کاٹو۔

۴۔ ۱۴ رسائل کا مجموعہ ۱۸۳۹ء بیروت میں چھپا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ رومانیہ کے کلیسا نے تیس ہزار دو سو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو پوپ نہ ماننے پر زندہ آگ میں جلایا ماخوذ از الجواب الفسیح لما لفقہ عبد المسیح لنعمان الوسی۔

قانون طلاق پر اعتراض: مستشرقین قبل ازیں اسلام کے قانون طلاق پر بھی اعتراض کرتے تھے۔ زمانہ کے عائلی ضرورتوں نے جب ان کو سبق سکھایا تو اسلام کے قانون فطری کی طرف رجوع کیا۔

شراب نوشی: مستشرقین پہلے تحریم شراب پر اعتراض کرتے تھے، لیکن اب قائل تحریم ہیں۔

۱۔ شراب اسلامی قانون کی نظر میں:۔ رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم ترحمون (قرآن مائدہ) شراب ناپاک اور شیطانی کاموں کا سرچشمہ ہے۔ اس سے دور رہو۔ اس میں شراب کی ناپاکی کو بیان کیا کہ شراب اور پاخانہ نجاست میں برابر ہے۔ لہذا شراب کا پیٹ میں جانا ایسا ہے جیسا پاخانہ پیٹ میں داخل کیا جائے۔ دوم یہ کہ اس کے پینے سے شیطانی اعمال وکردار کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور انسانی صورت میں شیطانی اعمال کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ سوم یہ کہ شراب سے الگ ہونے میں دین و دنیا کی کامیابی ہے۔ ورنہ دونوں جہانوں کی ناکامی یقینی ہے۔ روح المعانی سورۃ بقرہ کی تفسیر جلد اول میں حضرت علی سے روایت ہے کہ اگر کسی کنویں میں ایک قطرہ شراب ڈالا جائے اور اس کنویں پر منارہ تعمیر کیا جائے تو اس منارے پر اذان نہ دی جائے۔ گویا شراب کی نحوست سے اذان جیسی مقدس چیز بھی آلودہ ہو جائے گی۔

۲۔ شراب اور صحت بدنی:۔ ڈاکٹروں کا تحقیقی ادارہ سوئٹزرلینڈ میں قائم کیا گیا۔ پوری تحقیق کے بعد شراب کی مضرات پر اس نے رپورٹ میں دلائل اور تجربات سے ثابت کیا کہ شراب سے عمر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حافظ کمزور ہو جاتا ہے۔ ہاضمہ کا فعل ضعیف ہو جاتا ہے۔ دل سخت کمزور ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح بیشمار نقصان لکھ دیئے جس کے اثر سے امریکہ نے ۱۹۲۷ء میں ان نقصانات کو نشر کر کے شراب کی بندش کی، لیکن جب برائی پھیل جاتی ہے۔ تو اس کا ازالہ ایمانی قوت سے ہوتا ہے۔ اس لئے کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر احمد بک نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے کتاب اعلام الباحث بقبح ام الخبائث۔ جس میں یورپ کے ماہرین کے اقوال جمع کئے ہیں۔ بیشمار بدنی اور جسمانی مضرات شراب نوشی کے ثابت کئے ہیں۔ تحریر کیا ہے کہ شراب نوشی اول میں چستی لاتی ہے۔ بعد ازاں سستی۔ اس لئے جو مزدور و عمال شراب نوش ہیں،

مسلسل کام نہیں کر سکتے۔ بخلاف غیر شرابیوں کے کہ وہ مسلسل محنت برداشت کرنے کی اہلیت وقوت رکھتے ہیں۔

روحانی اخلاق کا زوال اور شراب نوشی ۱۔ شراب نوش زوال نشہ کے بعد بزدل ہوتے ہیں۔ کہ ان کے دل پر ایک غلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے دوران خون میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ ۲۔ شراب نوش بہت ضدی زیادہ اور رحمت و شفقت انسانی کم ہوتی ہے۔ ۳۔ شراب نوشی استقلال کو ختم کرتی ہے۔ اور اس کے کردار اور گفتار میں تضاد واقع ہوتا ہے اور ناقابل اعتماد ہو جاتا ہے۔ ۴۔ مشکل کام کی ہمت شراب نوش میں کم ہو جاتی ہے۔ اور معمولی دباؤ سے متاثر ہوتا ہے۔ ۵۔ زنا اور عیاشی کیطرف میلان بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین نے ہر نشہ بند کیا۔ ۶۔ روحانی اخلاق کیلئے بنیادی اساس عقل سلیم ہے۔ یہ شرف انسانی کا اصلی جوہر ہے۔ اور تمام کمالات و فضائل کا سرچشمہ ہے۔ شراب نوشی میں بار بار ازالہ عقل کی وجہ سے جوہر عقل انسانی کا اجلاء ختم ہو جاتا ہے۔ اور عقل اپنے اصلی کام خوف خدا اور خوف آخرت کے یقین و جزم اور اسکے مطابق عمل سے محروم ہو جاتی ہے۔ ۷۔ اندرون انسان میں سب سے بڑی اخلاقی حس حیاء ہے۔ جو صرف تمام حیوانات میں انسان کیساتھ مختص ہے۔ حیاء کیوجہ سے انسان ان فواحش و منکرات سے بچتا ہے۔ جو حیاء کے مقتضی کے خلاف ہے۔ جن اقوام یا افراد میں شراب نوشی پھیل جاتی ہے۔ تو ان میں وصف حیاء کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے کام میں وہ قوم شرم محسوس نہیں کرتی۔ موجودہ مغربی اقوام کی تاریخ اور کردار سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔ سان فرانسسکو میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے پر فوجیوں نے شراب پی کر ہزاروں دوشیزاؤں کی عصمت دری کی اور برسر بازار ان کو ننگا کر دیا۔ برطانیہ میں برائے اظہار بیحیائی مستقل ننگوں کی تعداد چھ لاکھ ہے۔ پاسبان ۲۰ / اگست ۱۹۵۲ء۔

۱۹۴۴ء کی جنگ میں امریکی فوجوں نے جاپانی ماؤں سے بیس لاکھ حرامی بچے پیدا کئے علاوہ خفیہ اور اسقاط کی صورتوں میں لیکن اسلامی فوجوں نے دنیا کا اکثر حصہ فتح کیا لیکن زنا کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔ نوائے وقت لاہور ۱۰ / اکتوبر ۱۹۵۲ء۔

امریکہ میں سیرائن نام نوجوان کے ساتھ تین دوشیزاؤں نے سات مرتبہ زنا بالجبر کیا اور پچاس ڈالر بھی چھین لئے۔ پاسبان کوئٹہ ۱۴ / مئی ۱۹۵۲ء

شراب نوشی کا مالی نقصان امریکہ کی سرکاری رپورٹ کے مطابق وہاں شرابیوں کی تعداد

۸ کروڑ ہے۔ جن میں ساٹھ لاکھ افراد سالانہ اپنی زندگیاں اس ام الخبائث کی وجہ سے ختم کر رہے ہیں۔ اور امریکہ شراب نوشی پر سالانہ تیس ارب بیس کروڑ ڈالر خرچ کرتا ہے۔ بہ تفصیل ذیل :
۱۔ عدم کارکردگی کے ضمن میں سالانہ دو سو کروڑ۔ ۲۔ شراب کی وجہ سے بیماریوں پر چار سو کروڑ سالانہ ڈالر۔ فساد و جرائم کی وجہ سے پچہتر کروڑ ڈالر۔ ۳۔ قید خانے کے انتظام کے لئے چار سو کروڑ۔ میزان ۱۹ ارب بیس کروڑ ڈالر۔ امریکہ رپورٹ مندرجہ پاسبان۔ کوئٹہ ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء۔

ڈاکٹر احمد بک حسین نے قبح ام الخبائث میں صفحہ ۸۵ تا آخر یورپ کے مختلف ممالک کے حوالجات سے ثابت کیا ہے۔ کہ بیمہ انشورنس کمپنیاں بہت ملکوں میں شراب نوشوں کو بیمہ نہیں کراتی۔ کیونکہ شراب نوشی سے جلد اور اچانک موت واقع ہوتی ہے۔ اور بعض ملکوں میں بیمہ کرائی جاتی ہیں۔ لیکن شرابی اور غیر شرابیوں کے رجسٹر اور شرحیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ تاکہ کمپنیوں کو نقصان نہ ہو۔

پاکستانی رقبہ میں انگریزی دور سے بتدریج شراب کا زیادہ استعمال ہونے لگا۔ اور جنگ ۱۹۶۵ء کی نسبت میں جنگ دسمبر ۱۹۷۱ء میں فوج میں شراب نوشی زیادہ ہوئی، جو شکست کا سبب بنی۔ گذشتہ جنگ میں جنرل ڈیگال نے صاف اعلان کیا تھا کہ ہماری فوج تعداد میں جرمن فوج سے زیادہ تھی لیکن ہم کو جرمن فوج نے نہیں بلکہ شراب نوشی نے شکست دی۔ پھر پاکستان جیسا غریب ملک جس میں عوام بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ زرمبادلہ اور دولت کو شراب اور سگریٹ جیسی مضر صحت چیزوں میں صرف کرنا ملک کو تباہی کیطرف لے جانا ہے جبکہ چین اور بھارت جیسے لامذہب ملکوں میں شراب بند ہے۔ ویٹ کانگ میں امریکی فوج کی ناکامیابی باوجود ان کے پاس بے پناہ سامان جنگ کے اور ویٹ کانگ والوں کی بے سروسامانی کے صرف امریکی فوج کی عیاشی اور شراب نوشی کا نتیجہ ہے۔ جسکی پاکستانی جیسی مفلس اور غریب قوم نقل اتار رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو بدل دیں تاکہ اللہ راضی اور ملک مستحکم و مضبوط ہو۔ پاکستان میں ترقی شراب ملاحظہ ہو۔

قیام پاکستان کے بعد اس رقبہ میں انگریزی دور سے شراب نوشی میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں ایک لاکھ ۴۲ ہزار ۲ سو گیلن بیئر شراب استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں تین لاکھ ۵ ہزار تین سو بیرانوے گیلن تک پہنچی۔ پہلے دوسری شراب پاکستان میں کشید نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب ایک لاکھ ۱۱ ہزار ۵۰۷ گیلن کشید وہ بھی کشید

کی جاتی ہے۔

۲۔ درآمد شراب بیرونی ممالک سے بذریعہ زرِ مبادلہ ۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی رقبہ میں شراب کی کل درآمد ۲ ہزار ۶ سو ساٹھ گیلن تھی۔ مگر اب ۹۲ ہزار ایک سو دس گیلن ہے۔ جو درآمد کی جاتی ہے۔ ناجائز طریقوں سے درآمد کردہ شراب اس کے علاوہ ہے۔ (ہفت روزہ المنبر لائل پور ۲۴ ر اگست ۱۹۶۲ء۔)

۳۔ سگریٹ کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ صرف ملتان شہر میں یومیہ چھ لاکھ سگریٹ استعمال ہوتے ہیں جس کی قیمت یومیہ تیس ہزار روپیہ ہے۔ یعنی ماہوار تقریباً تین لاکھ روپے اور سالانہ ۳۶ لاکھ روپے صرف ایک شہر ملتان کا خرچ سگریٹ ہے۔ پورے پاکستان میں غیر ملکی کمپنیاں ہر سال پونے دو کروڑ روپیہ رائلٹی وصول کرتی ہیں۔ (کوہستان ۱۷ر فروری ۱۹۶۸ء)

بقیہ: (مولانا عبدالشکور) یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

خطابت | ۱۹۴۶ء میں مسجد محلہ درویش ہری پور میں ۳ سال تک خطابت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۴۹ء میں سی۔ ایم۔ اے آفس راولپنڈی میں مدرسہ علوم اسلامیہ میں مدرس اسلامیات کی اسامی پر تقرری ہوئی اور ساتھ ہی آفس میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کئے رکھا۔ اگست ۱۹۵۲ء تک وہیں قیام رہا۔

سرکاری ملازمت | ۱۳ر اگست ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ ہائی سکول مانسہرہ میں مدرس عربی کی اسامی پر پہلی تقرری ہوئی۔ آپ نے ملازمت کے دوران پرائیویٹ امتحانات پاس کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

ایم۔ اے عربی میں اوّل آئے | ۱۹۶۴ء میں آپ نے رول نمبر ۹۴۵ کے تحت ایم۔ اے عربی کا امتحان دیا اور ۵۴۷ نمبر حاصل کر کے یونیورسٹی میں اوّل آئے، اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آجکل آپ اپنی پرانی پوسٹ پر ہی گورنمنٹ ہائی سکول ۲ ہری پور میں تدریس میں مصروف ہیں۔

سلسلۂ بیعت | شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح سے بیعت ہیں۔ ان سے والہانہ عقیدت و نسبت رکھتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

لسانی جھگڑوں کا واحد حل

جناب ڈاکٹر سید محمد یوسف
پروفیسر عربی، جامعہ کراچی

عربی کو لازمی قرار دیجئے

مولانا مفتی محمود کی خدمت میں

مولانا غلام غوث ہزاروی نے فرمایا تھا کہ "جمعیۃ عرصہ دراز سے یہ مطالبہ کر رہی ہے کہ انگریزی کی جگہ عربی کو نافذ کر دیا جائے تاکہ زبان کا تنازعہ یکسر ختم ہو جائے۔ ملک کے صوبوں میں جدا جدا زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اگر ان صوبوں میں انگریزی سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کی جاسکتی ہے۔ تو عربی کیوں نہیں کی جاسکتی۔ عربی کو پاکستان کے تمام عوام قبول کر لیں گے۔ کیونکہ وہ اس کا زبردست احترام کرتے ہیں"۔ (جنگ، کراچی ۳۰ اگست ۱۹۷۰ء)۔ جمعیۃ کے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی مولانا نے عربی زبان کو لازمی قرار دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ (حریت ۲۳ مئی ۱۹۷۲ء) مفتی محمود کی طرف سے اس وعدہ کی پابندی اور اس مطالبہ سے اتفاق لازمی امر ہے۔ لیکن ابھی تک موصوف نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔ حالانکہ یہ دین، ثقافت، قومی اتحاد اور عرب اور اسلامی دنیا سے ارتباط کے لئے بنیادی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ پشتو اور بلوچی نے اپنا جائز مقام لینے کے لئے تیاری شروع کر دی ہے۔ اس ذیل میں بلوچی کے لئے رومن رسم الخط کی بھی تجویز ہے۔ اردو کے نادان اور خود غرض دوستوں نے کوئی تعمیری کام نہ کیا اور اردو کو سیاسی نعرہ بنا دیا۔ اردو ہی کی بدولت مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوا۔ اور آج بچے کھچے پاکستان میں بھی اردو وجہ افتراق بنی ہوئی ہے۔ پہلے کبھی کراچی یونیورسٹی میں سندھی کو پر مارنے کی اجازت نہ تھی۔

اسی سال سندھی کا شعبہ کھلا ہے۔ اس وقت جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اس سندھی شعبہ کے دروازے کھڑکیاں توڑی جا رہی ہیں۔ اور کتابیں جلائی جا رہی ہیں۔ کل سندھ اسمبلی نے جو لسانی بل پاس کیا ہے۔ یہ اس کے خلاف احتجاج ہے۔ کیا ایسے حالات میں بھی مسلمانوں کے سامنے عربی کا نام لینا گناہ ہے؟ اب تو اس بدنصیب ملک میں عربی کو رونے والے بھی مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ مفتی محمود صاحب اور مولانا ہزاروی صاحب سے فریاد کی جرأت کر رہا ہوں۔

فضیلۃ المفتی! تحیۃ وسلاما۔

مجھ جیسے عربی و اسلامی علوم کے طالب نے قیام پاکستان سے جو امیدیں باندھی تھیں۔ آج وہی امیدیں آپ سے وابستہ ہیں۔ شدید مایوسی کے بعد یہ امیدیں دوبارہ اس اعتماد کے ساتھ ابھری ہیں کہ آپ عربی و اسلامی علوم کے ماہر ہیں۔ اور اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ان علوم کے ساتھ مکر و نفاق، اسلام اور اسلام کی بنیاد پر قائم معاشرہ اور حکومت، سب کے ساتھ غداری ہے۔

دورِ ایوبی کا سب سے گھناؤنا عمل اسلام کی تدریس اور علمی تحقیق سے متعلق ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں ایوب نے ایسے نام نہاد ماہرین سے کام لیا جو آمریت کے مقاصد کی تکمیل میں اس کے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ انہیں میں سے ایک دو نے عربی و اسلامی علوم کا جاہل مطلق ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی سے اسلام کا ٹھیکہ لے لیا۔ اور آمریت کے حق میں اسلام کا استغلال کرنے کے لئے وہ "اسلامیات" ایجاد کی جو آج ہمارے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ اس اسلامیات کو بالقصد عربی سے جدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایم۔ اے اسلامیات بھی قرآن و حدیث کے ادنیٰ فہم سے قاصر رہتا ہے۔ اور صرف اردو یا انگریزی میں اسلام کی "تحسین ناشناس" کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ عوام کے دینی جذبات کو سلانے کے لئے ایک افیون ہے۔

اسی کی بدولت اسلام ایک "نظریۂ حیات" بن چکا ہے۔ اور اس نظریہ (آئیڈیالوجی) نے ہمارے یہاں (کراچی یونیورسٹی میں) ایک مستقل تدریسی مادہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ پوری تاریخ میں عربی اسلامی علوم کے خلاف اتنی بڑی منظم سازش نہیں ہوئی۔ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی اسے کوئی دیانت دار، مسلم تو مسلم، غیر مسلم بھی روا نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات سے مراد عربی زبان اور قرآن و حدیث ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں اسلامیات میں عربی زبان

اور قرآن و حدیث کے سوا سب کچھ ہے۔

اسلام سے متعلق علمی تحقیق اور ریسرچ کے جو ادارے قائم کئے گئے ان میں بھی دیدہ و دانستہ عربی و اسلامی علوم کی مرکزی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا، چنانچہ اندرون ملک اور بیرون ملک یہ ادارے کوئی وقار حاصل نہ کر سکے اور شک و شبہ کی نظر سے ...... دیکھے جانے لگے۔

ہمارے ملک میں بالخصوص کراچی میں، ایک مفاد پرست طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسلام کا رشتہ عربی سے توڑ کر اردو سے جوڑ رکھا ہے۔ اس سے خود اردو کی صورت بگڑ گئی ہے۔ اور اسکی توانائی ختم ہو گئی ہے، دوسری طرف اردو منافرت اور افتراق کا سبب بن گئی ہے۔

ان حالات میں چند تجاویز پیش خدمت ہیں۔ آپ صوبہ سرحد تک ان کو عملی جامہ پہنانے کے مجاز ہیں۔ ایک اچھی مثال قائم ہو گی تو ملک کے دوسرے حصے بھی اس سے متاثر ہونگے۔

۱- ابتداء سے لیکر اعلیٰ درجہ تک جو بھی دینی تعلیم ہو، اس کا محور عربی زبان و ادب اور قرآن و حدیث ہونا چاہیئے۔ "اسلامی نظریہ" کی اصطلاح کو یکسر خارج کر دینا چاہیے۔ یہ خالص مغربی اصطلاح ہے اور اسلامی شریعت سے کترانے کے لئے اور اسلامی قوانین سے توجہ ہٹانے کے لئے رائج کی گئی ہے۔

۲- یہ تو ہر مکتب خیال کے نزدیک مسلّم ہے کہ عصری تقاضوں کی خاطر انگریزی کی تعلیم لازمی رہے گی۔ کیا عربی کی لازمی تعلیم دین، ثقافت، نیز سیاست اور اتحاد اسلامی کا تقاضا نہیں۔؟ پھر کیوں نہ عربی کو لازم کیا جائے؟ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ــــــ دینی مدارس میں اردو کبھی نہیں پڑھائی گئی، عربی پڑھائی جاتی تھی۔ (اور آج بھی صرف عربی پڑھائی جاتی ہے۔) اسی سے اردو کو اور قومی یکجہتی کو فروغ ہوا۔ اور اسی کی بدولت علاقائی زبانیں ایک دوسرے سے قریب آئیں اور ان میں اسلامی افکار اور عربی الفاظ نے قدر مشترک کی حیثیت سے جگہ پائی۔ یہ ایک دھوکا ہے۔ کہ اردو قومی اتحاد کی علامت ہے۔ قومی یکجہتی کا دارومدار عربی اسلامی علوم پر ہے۔ اگر اردو کوئی حیثیت رکھتی ہے۔ تو وہ خود اپنے نمو کے لئے عربی کی محتاج ہے۔ اس لئے لسانی نزاع کا بہترین حل یہ ہے کہ انگریزی اور عربی کو لازمی قرار دے کر طالب علم کو اختیار دیا جائے کہ وہ اردو، سندھی، پشتو، بلوچی میں سے کوئی ایک تیسری زبان پڑھے (جہاں تک اس زبان میں اعلیٰ ادب پایا جاتا ہو۔) ــــــ بنگال میں بھی عربی زبان سیکھنے میں کسی کو تامل نہ تھا۔

باقی صفحہ ۳۷ پر

حکومتِ سرحد

کی خدمت میں

چند تعلیمی اور اصلاحی تجاویز

• ـــ مصطفٰی عباسی ایم اے
• ـــ حکیم محمد علی گوجرانوالہ
• ـــ محمد اسلم ایم اے لاہور

مکرمی مدیر صاحب ! السلام علیکم ۔ میں آپ کے ماہنامہ "الحق" کے ذریعہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب وزیرِ اعلیٰ صوبہ سرحد کی توجہ حسب ذیل امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں :

۱۔ جنابِ موصوف نے وفاق المدارس کی اسناد کے حامل علماء کرام کو ایم۔ اے کا مقام دیکر علم دوستی اور دینِ اسلام سے محبت کا ایک اور ثبوت دیا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ آمین

۲۔ درسِ نظامی کے فاضل حضرات صرف ــــــــــــــــــــــــــــــ اسلامیات میں نہیں بلکہ فارسی اردو عربی اور اسلامیات چار مضامین میں ایم اے کی قابلیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف اسلامیات کے معلم کے طور پر نہیں بلکہ اردو عربی فارسی اور اسلامیات کے معلموں کی حیثیت سے خدمات کا موقع دیا جائے۔

۳۔ درسِ نظامی یا مولوی فاضل وغیرہ نصاب میں تکمیل کی اسناد کے حامل تمام علماء کرام کو یہ حق ملنا چاہئیے کہ وہ عربی فارسی اردو اور اسلامیات میں بی اے کی انگریزی کا امتحان پاس کئے بغیر ایم۔ اے کے امتحانات میں شریک ہو سکیں۔ تاکہ جو حضرات کالجوں یا یونیورسٹیوں میں بطور معلم خدمات انجام دینے پر خطابت تبلیغ ، صحافت ، تالیف و تصنیف ، یا دینی مدارس میں کام کرنے کو ترجیح دیں۔ انہیں جدید معاشرے میں وہ مقام مل سکے جس کے وہ اہل ہیں۔

۴۔ غیر ممالک میں پاکستانی سفارت خانوں میں علمائے کرام کو بھی خدمات کا موقع دیا جائے۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ سفیر اور ان کا عملہ پاکستان کی سرکاری حکمتِ عملی کی ترجمانی کرتے ہوں تو ممکن ہے اس میں انہیں کامیابی ہوتی ہو لیکن اسلام کی ترجمانی جسکی اشد ضرورت ہے۔ ان لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ فرض کریں جاپان میں پاکستان کے سفارت خانے میں بدھ مذہب کے چند علماء آتے ہیں اور

چاہتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کریں تو ایک جدید اور مستند عالم کی غیر موجودگی میں انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

۵۔ دینیات عربی اور علوم شرقیہ کو سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لازمی قرار دینے اور ان کی تدریس کے لئے علماء کرام کی خدمات حاصل کر لینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جس کے لئے آپ (مفتی صاحب) یہ سب کچھ کر رہے ہیں، اس لئے کہ تعلیم کے پورے نظام پر مغرب زدہ ذہن کے لوگ قابض ہیں اور ان کے تحت علماء کا کام کرنا نہ صرف علماء کی تحقیر ہوگی بلکہ اس مقصد کی بھی توہین ہوگی جس کے حصول کی خاطر علماء کرام کو تعین کیا جائے گا۔ اور ہمارے اساتذہ عام حالات میں احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں ایسا ہو چکا ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمات دینیہ کی ایک الگ وزارت قائم کی جائے اور تجربے کے طور پر چند سکولوں اور کالجوں کا نظام اس وزارت کی نگرانی میں چلایا جائے۔

۶۔ عربی مدارس کے نصاب میں عمرانی علوم کا اضافہ کیا جائے۔ یہ علوم عربی زبان میں پڑھائے جائیں۔ اور اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ دینی مدارس کا ماحول اور نظم و نسق کا موجودہ طریق متاثر نہ ہونے پائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ اور ہمارے جدید نظام تعلیم کے ارباب نسبت و کشاد کیلئے سوچ کی راہیں کھل جائیں گی۔

۷۔ صرف عربی زبان کو لازمی قرار دینے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عربی کا نصاب اور اسکی تدریس کے لئے وقت اور امتحانات میں۔ اسکی اہمیت میں تبدیلی کی جائے۔ میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب چرتھاولی کا ترتیب دیا ہوا عربی نصاب چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک مختلف مراحل میں پڑھایا جائے اور عربی کی تدریس کیلئے انگریزی کے برابر وقت دیا جائے اور امتحان پاس کرنے کے لئے عربی میں پاس ہونا ضروری قرار دیا جائے۔

۸۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جو طالب علم عربی پڑھنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ سائنس نہ پڑھے۔ عربی کو سائنس کے مقابلے میں رکھ کر عربی کے مقام کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز عربی کے مقابلے میں فارسی رکھی گئی ہے۔ جو عربی کی نسبت ایک آسان مضمون ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ذہین طالب علم تو سائنس کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور باقی ماندہ طالب علم آسانی اور سہولت کی خاطر فارسی رکھ لیتے ہیں۔ مزید ستم کی بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی تدریس کے لئے فارسی

کے مقابلے میں کم و بیش دوگنا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کا بدلنا از بس ضروری ہے۔ عربی کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے۔ عربی کی تدریس کے لئے زیادہ وقت مخصوص کیا جائے۔ اور عربی کے اساتذہ کو انکی قابلیت کے مطابق مقام اور خدمات کا صلہ دیا جائے۔

۹۔ اب جبکہ اردو سرکاری زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ محکمۂ تعلیم میں انتظامی امور زیادہ سے زیادہ علماء کرام کے حوالے کئے جائیں۔ اور جن حضرات کو محض انگریزی دان ہونے کے باعث، کلیدی عہدوں پر تعینات کیا گیا ہے۔ انہیں چھٹی دی جائے حالات اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ لوگ ان عہدوں کے اہل نہیں تھے۔ سرکاری مدارس میں افراتفری، طلبہ میں بے چینی معیارِ تعلیم کا پست سے پست تر ہو جانا امتحانات میں دھاندلیاں اور دولت کا بے انداز خرچ یہ سب اس بات کے شواہد ہیں کہ یہ لوگ (انگریزی دان) اپنے فرائض کی ادائیگی کے اہل نہیں تھے۔ انہیں محض اس لئے کلیدی عہدے دے گئے تھے کہ سرکاری زبان انگریزی تھی۔ اور یہ انگریزی جانتے تھے۔ لیکن اب جبکہ سرکاری زبان اردو ہے۔ انہیں فارغ کر دینا ضروری ہو گیا ہے۔ ہمارے دینی مدارس کا نظم و نسق معیارِ تعلیم اور امتحانات کا نظام اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ علمائے کرام میں انتظامی صلاحیت زیادہ ہے۔　(مصطفیٰ ہاشمی۔ ایم اے)

★

۱۔ اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ و ذروا البیع کے حکم کے تحت یہ حکم نافذ ہونا چاہئے کہ جمعہ کی پہلی اذان کے بعد ہر قسم کی خرید فروخت قطعاً منع قرار دی جائے۔

۲۔ ہر بالغ مسلمان پر نماز پنجگانہ کی ادائیگی لازمی قرار دی جائے اور اسکی تکمیل کیلئے مسجدوں میں ہر نماز کے وقت حاضری کی جائے۔ اور اس کے لئے باقاعدہ رجسٹر رکھے جائیں۔ بلا عذر غیر حاضر ہونے والے سے باز پرس کی جائے۔

۳۔ رمضان المبارک میں کل ہوٹل، تنور، حلوائیوں کی دکانیں اور ہر قسم کے مشروبات کی دکانیں دن کے وقت بند رکھنے کے احکام نافذ کئے جائیں۔

۴۔ سود کی کاروبار قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔

۵۔ جائز پیشہ وروں کو حقیر سمجھنا کہ یہ دھوبی ہے یہ نائی ہے یہ تیلی ہے۔ یہ لوہار ہے۔ یہ موچی ہے ممنوع قرار دیا جائے۔

۶۔ لڑکیوں کی شادی کے موقعہ پر لڑکے والوں سے بڑی بڑی بھاری رقومات وصول کرنا قانوناً

ممنوع قرار دیا جائے۔

میں امید کرتا ہوں کہ قبلہ محترم حضرت مفتی صاحب اس پر غور فرما کر اسمبلی کے ایجنڈے میں رکھ کر یا اپنے اختیارات خصوصی کی بنا پر اس پر عملدر آمد فرما دیں گے۔

(حکیم محمد علی فاضل طب و جراحت۔ گوجرانوالہ)

★

تعلیم اور لسانی مسائل | یہ خبر پڑھ کر از حد خوشی ہوئی ہے کہ حکومت صوبہ سرحد عربی کو لازمی زبان قرار دے رہی ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی ترویج کی طرف اہم قدم ہے۔ اور قابل تحسین بھی۔ لیکن جو بات یہاں غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان طالب علم ساری عمر مختلف زبانیں سیکھنے کے چکر میں ہی پڑے رہیں گے۔ مثلاً صوبہ سرحد کے عوام اپنی مادری زبان پشتو اپنی ماں کی گود میں سیکھتے ہیں۔ ہر بچہ اپنی مادری زبان ایسے ہی سیکھتا ہے۔ پھر سکول میں انگلش اور اردو زبانیں لازمی ہیں۔ اس کے بعد عربی زبان بھی لازمی ہو جانے سے چار زبانیں لازمی ہو جاتی ہیں۔ مادری زبان تو ہر شخص کو از خود ہی آجاتی ہے۔ باقی تین زبانوں کو پڑھنے، لکھنے، سمجھنے بولنے کے قابل بننے کیلئے کتنی محنت درکار ہو گی۔ اس کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ صرف انگریزی کا امتحان پاس کرنے کے لئے ایک طالب علم اتنی ہی محنت کرتا ہے، جتنی باقی تمام مضامین میں اُسے کرنا پڑتی ہے۔ اور پھر بھی کامیابی یقینی نہیں ہوتی۔ پشاور یونیورسٹی کے ایک سابقہ وائس چانسلر (شاید وہ جناب محمد علی صاحب تھے) نے ایک دفعہ ایک انگلش لیکچرر کے امیدوار کی عرضی میں کافی غلطیاں پائیں اور ملک میں تعلیمی معیار پر افسوس کا اظہار اس طرح کیا کہ اس امیدوار کی فوٹو کاپیاں دوسری یونیورسٹیوں میں بھیج دیں تاکہ وہاں بھی ایک غیر ملکی زبان میں ایم اے پاس کی قابلیت کا پول کھل جائے اگر یہی حال ہمارا عربی میں ایم اے کرنے پر ہوا تو ہمیں پہلے ہی یہ کہہ دینا چاہئے کہ ہمارے نوجوانوں کی عمریں زبانیں سیکھنے میں صرف ہو جائیں گی۔ جبکہ موجودہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔

راقم عربی زبان کا مخالف نہیں، بلکہ یہ ہماری مذہبی زبان ہے۔ اور ہمارے مذہب کا منبع ہے۔ اسے سیکھنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ ہمیں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم پر بھی توجہ دینی چاہئے، تاکہ ہم اپنے مقصد پیدائش و فرائض زندگی کو بخوبی سمجھ سکیں۔ چنانچہ عربی کو جائز مقام دلانے کے لئے ایک تجویز سمجھ میں آئی ہے کہ انگلش کو اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی جائے۔ اس پر لوگ یہ ضرور کہیں گے کہ اس طرح سائنس، ٹکنالوجی و جدید علوم کی تحصیل میں دشواریاں پیش آئیں گے۔ اس کا ایک حل یہ ہے کہ جو حضرات اپنے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا سائنسدان بنانا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ بچوں کو ابتدا سے ہی

انگلش بطور اختیاری مضمون پڑھائیں۔ اور جو بچے میٹرک۔ الف اے۔ کرنے کے بعد ڈاکٹر، انجنیئر بننا چاہتے ہوں اور انہوں نے انگلش ابتدا سے نہ پڑھی ہو۔ ان کے لئے سپیشل کلاسیں لگائی جائیں اور وہ میٹرک۔ الف اے کے انگلش مضمون کے امتحان علیحدہ جیسا کہ پہلے کسی زمانہ میں مڈل کے لئے ہوا کرتا تھا، دیں۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ مثلاً:

جو بچے دوسرے مضامین میں اعلیٰ نمبرے کر پاس ہوتے ہیں۔ لیکن صرف انگلش میں ناکامی ان کو تحصیلِ علم سے متنفر و ناکام بنا دیتی ہے۔ اپنی تعلیم ادھوری نہیں چھوڑیں گے بلکہ اُسے مکمل کرنے کے بعد نمایاں کامیابی حاصل کریں گے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۵۶ء میں میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہماری کلاس میں ۳۳ لڑکے تھے، جن میں سے صرف تین کامیاب ہوئے۔ ۳۰ طالب علم جو فیل ہوئے وہ صرف انگلش ہی میں فیل ہوئے تھے۔ ان میں ایسے طالب علم بھی تھے، جو بہترین ذہانت کے مالک تھے۔ اب وہ کوچوان گاڑی بان اور پرچون فروش ہیں۔ جبکہ وہ کلاس میں حساب، سائنس، ڈرائنگ و دیگر مضامین میں بہت اچھے نمبر حاصل کرتے تھے۔ اور آخر دو سال بعد اس سکول کو جسے لاہور کارپوریشن چلاتی تھی، غیر تسلی بخش نتیجہ نکلنے پر بند کر دیا۔ آپ خود اندازہ لگائیں اس سے کتنے بچوں کا مستقبل تاریک ہوا ہوگا۔ چنانچہ انگلش کے بغیر طالب علم صرف اپنی تعلیم مکمل ہی نہیں کریں گے۔ بلکہ دوسرے مضامین میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کریں گے اسی طرح بچوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور وہ اپنی تعلیم بھی آسانی سے حاصل کر سکیں گے۔ اس سے بچوں کو اتنا وقت بخوبی مل سکتا ہے۔ کہ وہ دوسرے مضامین کیطرف تندہی سے توجہ مرتکز کر سکیں اور نمایاں کامیابی حاصل کر کے والدین کی حوصلہ افزائی بھی کریں۔

ہمیں زبانوں کے مضامین کے سلیبس کبھی تبدیل نہ کرنا چاہئے تاکہ طالب علم آسانی سے اور جلد از جلد اس زبان کو پڑھ لکھ سکے۔ زندگی کے قیمتی سولہ بیس سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اگر ایک صاحب کو اپنے پاس کردہ مضمون جسکا وہ ماسٹر ہو پڑھنے، لکھنے، سمجھنے اور سمجھانے میں مہارت نہ ہو تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اپنے والدین کے خون پسینہ کی کمائی کو ہی ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کے بہترین دور کو ضائع کر دیا جبکہ زندگی کا یہی قدر اصل زندگی بناتا ہے ۔۔۔ ہمیں اپنے بچوں، نوجوانوں طالب علموں کی زندگیاں سنوارنے میں ہر قدم اٹھانا چاہئے۔ اور ملک میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے نئی پود میں نئی روح پھونکنی چاہئے۔ اور ان کی زندگی صحیح راستے پر گزارنے کیلئے صحیح رہنمائی و رہبری کرنی چاہئے۔ چنانچہ ہمیں انگلش، اردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی و دیگر زبانوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے ستاروں پر کمند ڈالنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ ملک میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے۔

(محمد اسلم۔ ایم اے اردو، انگلش۔ لاہور)

نئی تہذیب کے ہاتھوں انسانیت اپنا سر پیٹ رہی ہے

انسان حیوانیت کے گھڑے میں

(جناب ریاض الحسن نوری۔ ایم۔ اے)

جدید تہذیب اور قتلِ جنین اقتلِ جنین (ABORTION) کا رائج العام ہونا نہ صرف کسی معاشرے کے جنسی فساد کا ثبوت ہوتا ہے، بلکہ فطرت سے یہ طریق تصادم بتاتا ہے کہ انسانیت کے اعلٰے جذبات اور قیمتی اقدار کی تباہی ہو چکی ہے۔ مغربی معاشروں میں قتلِ جنین ایک کھیل بن چکا ہے۔ وہاں اداروں نے اسقاط کو لفظ "مل" (MILL) بہ معنی کارخانہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یعنی کارخانہ ہائے قتلِ انسانِ نامولود۔ ان ترقی یافتہ اداروں کی رفتارِ کار اتنی تیز ہے کہ "مریضہ" داخل ہونے کے آدھ گھنٹہ بعد اپنے بارِ حمل سے فارغ ہو جاتی ہے۔ ایک پروبیشن افسر نے ایک ڈاکٹر سے دریافت کر کے بیان کیا ہے کہ وہ ہفتہ کے روز ایسے کیس ۵۰ کر لیتا ہے۔ اوسطاً اس خدمت کو انجام دینے والے ڈاکٹر سالانہ ۱۰، ۵ ہزار کیس کرتے ہیں۔ بہت سے کیس پرائیویٹ اداروں کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی معاملہ بگڑ جائے تو پھر سرکاری ہسپتالوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر مغربی دنیا میں قتلِ جنین یا اسقاط کے واقعات کی سالانہ تعداد لاکھوں سے گزر کر کروڑوں تک پہنچتی ہے۔

روس میں ۱۹۵۵ء تک اسقاط کرنا کرانا خلافِ قانون تھا۔ لیکن ۲۳ نومبر ۱۹۵۵ء کو ایک قانون کے ذریعے مستند (QUALIFIED) ڈاکٹروں کے ہاتھوں اسقاط کرانا جائز کر دیا گیا۔ روس میں رہائشی انتظامات کی کمی، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی یکجائی اقامت اور مرد و زن کے اختلاط عام نے قتلِ جنین کی مصیبت آہستہ آہستہ عام کر دی ہے۔ پہلے غیر قانونی صورتوں میں اور اب

قانونی راستے سے ۔

خیال رہے کہ جدید تہذیب کے یہ حالات برتھ کنٹرول کے باوجود ہیں۔ جس کا نیا خوبصورت نام ترقی پذیر ممالک کے لئے فیملی پلاننگ تجویز کیا گیا ہے۔

جنسی گندگی | کسی نظریۂ حیات اور تہذیب کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی انسان کو اچھا انسان بنا سکے۔ اسے خواہشوں کی غلامی کی پستی سے اٹھا کر خواہشوں کو اخلاقی انضباط میں رکھنا سکھائے۔ بصورت دیگر جو نظام یا تہذیب انسان کو خواہشوں کی سواری بنا دے، اس کے دوں نہاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ خصوصیت سے کسی معاشرے میں جنسی میلانات کے لئے اگر حسنِ انضباط نہ پایا جاتا ہو تو وہ حیوانی سطح تک گر جاتا ہے۔

اس معاملے میں یورپ کا حال یہ ہے کہ ایسے واقعات شاذونادر نہیں ہیں کہ بہن بھائی آپس میں ناجائز تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ امریکہ میں یہ رواج پھیلتا جا رہا ہے۔ کہ مرد آپس میں ہفتہ عشرہ کے لئے اپنی بیویاں بدل لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں "پگڑی بدل بھائی" کا محاورہ تھا۔ امریکہ میں اب "بیوی بدل دوست" کا نیا محاورہ تشکیل پا رہا ہے۔ گرل فرینڈ کا رکھنا تو شرافت و شائستگی کی ایک عام نشانی ہے۔ یہ حال ہے ان ممالک کا جو اسلام کے قانون تعددِ ازدواج (جو محدود بھی ہے۔ اور مشروط بھی) پہ حرف رکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی معاشروں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والے شاذونادر افراد کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، اور مغرب کی عشقیہ دوستی اور التعلق بلا نکاح کا ہزارواں حصہ بھی رائج نہیں۔

سفید کمال اور جدیدیت کے پیچھے یورپ میں انتہائی گندہ آدمی پایا جاتا ہے۔ جو نہ رفع حاجت کے بعد استنجا کرنا جانتا ہے، نہ غسلِ جنابت کا پابند ہے۔ اور نہ کھانے کے بعد کلی کرنے کے آداب سے آشنا ہے۔ اس مہذب آدمی "کے اطوار کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ زوجین اور گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈ ایک دوسرے کے خفیہ اعضاء کو چاٹنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے اور اس گھناؤنے ______ اور کریہہ فعل میں امریکہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ مرد و زن میں سے تقریباً ساٹھ فیصد بری طرح مبتلا ہیں [1] یہی نہیں بلکہ یورپ کے ماہرین جو شادی شدہ لوگوں کے لئے بزعم خود سائنٹفک ہدایات پہ کتابیں لکھتے ہیں۔ وہ اپنی کتابوں میں اس قبیح اور غلیظ فعل کی نہ صرف تحریک پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ اسے عین تقاضائے فطرت

---

1 CAPRIO M. D IN HIS BOOK VARIATIONS SEXUAL BEHAVIOUR PAGE. 266

قرار دیتے ہیں۔ ہاں ان کے نزدیک اس فعل کو صرف اس صورت میں غیر فطری کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ یہ عمل فعل یعنی جماع کا قائم مقام بن جائے اور صرف اسی پہ اکتفاء کی عادت ہو جائے ۔لہ

بیعت کا انوکھا طریقہ آج کل ہی نہیں بلکہ قرون وسطیٰ میں بھی یورپ میں بہت سے عیسائی مذہبی فرقے اور جماعتیں ایسی تھیں جن میں بیعت کا طریقہ یہ رائج تھا کہ مرید کو مرشد کی مقعد کا بوسہ لینا پڑھتا تھا۔ دریں حالات ہم کہتے ہیں کہ ایسی گندہ اور نجس قوموں کے ہاتھ کے ذبیحے کا تو سوال ان کے ہاں کے بنے ہوئے بسکٹوں وغیرہ کا خیال کر کے بھی ہمیں تسلی ہوتی ہے۔

لہ IDEAL MARRIAGE BY VEIDE M.D. PUBLISHED BY HEINEMANN MEDICAL BOOKS PAGE 148, 149.

قارئین کو متعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ گندگی تو یورپین نسلوں کا قدیم خاصہ ہے۔ جو لوگ اعضائے تناسل کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان اعضاء کی گندگی سے پرہیز کے کیا معنی۔ ؟ چنانچہ ریفر کیپریو اپنی کتاب "VARIATIONS IN SEXUAL BEHAVIOUR" (REFER CAPRIO M.D) کے صفحہ ۲۰۹ میں ایک امریکی کا بیان لکھتا ہے:

"I SWALLOWED THE SEMEN DURING EXCITEMENT."

"یعنی میں نے جوش میں آکر مادہ تولید کو بھی نگل لیا۔ نیز اس کتاب میں امریکہ کے ایسے لوگوں کا ذکر بھی ہے۔ جو دوسروں کو یا اپنی بیویوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے منہ میں پیشاب کرو۔ اور اس طرح پیشاب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ صـ۲۷"

مندرجہ بالا نجس عادات وافعال کے علاوہ بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں۔ جو آجکل کی اس مہذب اور متمدن قوم میں عام پائی جاتی ہیں۔ اور جن کا ذکر بھی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔ تاہم چند باتیں اس لئے درج مضمون کر دی گئی ہیں۔ کہ موجودہ دور یورپ کی تقلید میں اندھا دھند بھاگنے والے مسلمان، تہذیب یورپ کے ان نادر شاہکاروں سے واقف ہو کر باآسانی یہ اندازہ لگا سکیں کہ جو لوگ بظاہر ایک پلیٹ میں مل کر کھانا کھانے کو صفائی کے منافی اور اصول صحت کی رو سے قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا باطن کس قدر غلیظ اور مکروہ ہے۔ تعجب ہے کہ اس قدر نجس اقدار کے حامل لوگ مسلمانوں پہ ایک برتن میں کھانے اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کی وجہ سے طعن کرتے ہیں حالانکہ جدید سائنس بھی ـــ جس پہ ان کو ناز ہے ـــ چمچ کی بجائے ہاتھ سے کھانے اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کو صحت اور نظام ہضم کے لئے نہایت مفید قرار دے چکی ہے۔ (ماہنامہ محدث)

کنزے کی رپورٹ کا خلاصہ RICHARD LEWINSOHN M.D. لکھتا ہے کہ کنزے رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں ۸۰ فیصد مرد اور تقریباً ۵۰ فیصد عورتیں شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فیصد مردوں نے ایسے جنسی تعلقات قائم کئے جو خلاف قانون تھے۔ ۷۰ فیصد نے رنڈیوں سے تعلقات قائم کئے اور ۴۰ فیصد شادی شدہ مرد اپنی بیویوں سے بے وفائی کرتے ہیں۔ ۳۷ فیصد مردوں اور ۱۹ فیصد عورتوں نے ہم جنسوں سے تعلقات قائم کرنے کو تسلیم کیا، کھیتوں پر کام کرنے والے ہر چھ لڑکوں میں سے ایک جانوروں سے بدفعلی کا مرتکب ہوتا ہے ؎۱

مذکورہ بالا محقق، E.S. TURNER کے حوالے سے کنزے سے قبل کے دور کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"...... شادی سے قبل جنسی تعلقات قائم کرنے کی وجہ سے جو بچے پیدا ہوتے تھے۔ ان میں سے سرکاری ملازمین کے بچوں کی تعداد ۱۴ فیصد، ڈاکٹروں اور وکلاء کے بچوں کی تعداد ۲۰ فیصد اور پادریوں، استادوں اور افسروں کے بچوں کی تعداد ۱۵ فیصد ہوتی تھی۔"

۱۹۳۸ء میں انگلینڈ میں جو حمل شادی سے پہلے ٹھہرے مگر وضع حمل سے قبل نکاح کے ذریعے ان کو جائز کرلیا گیا ؎۲ ان کی تعداد ناجائز طور سے پیدا ہونے والے بچوں سے دگنی تھی۔ (یہ ذکر ۱۹۳۸ء کا ہے اور اب تو اس سلسلہ میں بہت ترقی ہو چکی ہے۔)

برٹرینڈرسل اپنی کتاب MARRIAGE AND MORALS BY BERTRAND RUSSELL کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھتا ہے:

"جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ، انگلینڈ، جرمن اور سکنڈے نیویا میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ باعزت خاندانوں کی کثیر (VERY-MANY) اس کو ضروری (WORTH WHILE) نہیں سمجھتیں کہ عصمت کی حفاظت کی جائے اور نوجوان اب رنڈیوں

؎۱ P 356 A HISTORY OF SEXUAL CUSTOMS BY RICHARD LEWINSOHN M.D.

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ہونے کے علاوہ P.H.D بھی ہیں اور مشہور محقق ہیں۔ ان کی اس کتاب کا ۱۹۵۸ء میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء تک اس کے آٹھ ایڈیشن صرف انگریزی زبان میں چھپ چکے تھے۔ ؎۲ یاد رہے کہ امریکہ اور یورپ میں یہ بات قانونی حیثیت رکھتی ہے کہ اگر حمل ٹھہرنے کے بعد وضع حمل سے پہلے پہلے کسی وقت بھی نکاح پڑھوا لیا جائے تو ایسا بچہ جائز متصور ہوگا۔

کے پاس جانے کے بجائے ایسی لڑکیوں سے تعلقات قائم کر لیتے ہیں جن سے کہ اگر وہ امیر ہوتے تو شادی کے خواہش مند ہوتے...... امریکہ میں بہت ہی کثیر تعدادمیں (A VERY LARGE PERSENTAGE) لڑکیاں کئی کئی عاشق بنا لیتی ہیں، اور بعد میں شادی کر دا کے بہت ہی باعزت بن جاتی ہیں۔"

یورپ کی ان ہی حماقتوں کی بنا پر LEOPOLD ASAD نے مغربی تہذیب کو "کانا دجّال" کہا ہے۔ جو صرف ایک آنکھ سے دیکھتی ہے۔ اور دوسری آنکھ اس کی ہے ہی نہیں۔ چنانچہ نتیجۃً نہ صرف خود مضحکہ خیز بن کر رہ گئی ہے۔ بلکہ دوسروں کو بھی تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔

خنزیر خوری اور جنسی گندگی | دنیا جانتی ہے۔ کہ سور ایک ایسا جانور ہے کہ غلاظت اور فضلہ جس کا من بھاتا کھاجا ہے۔ پس جو لوگ اس کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں یہ اثرات آنے لازمی ہیں۔ چنانچہ CAPRIO نے اپنی کتاب VARIATIONS IN SEXUAL BEHAVIOUR میں مختلف جنسی عادتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو مغربی دنیا میں عام ہیں ان میں سے ایک ANILINGUS ہے۔ جس کے معنی میں وہ لکھتا ہے کہ یہ ایسی عادت ہے۔ کہ جس میں کوئی شخص دوسرے انسان کے خاص پاخانہ نکلنے کے مقام کو زبان سے چاٹ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ سور کا گوشت کھانے والوں میں ایسے لوگوں کا پیدا ہونا کوئی زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں۔ یورپ میں لواطت کا عام رواج بھی خنزیر خوری ہی کا کرشمہ ہے۔ چنانچہ اب تو وہاں مردوں کی مردوں سے شادیاں بھی ہونے لگی ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق مصنف مذکور لکھتے ہیں کہ :

"Paradoxically some homosexuals claim that the idea of having sex relations with a woman is revolting. The mere mention of cunnilingus disgusts them. Yet they have no reluctance to performing fellatio to completion or performing anilingus on men."

ترجمہ: الٹی بات یہ ہے کہ کچھ ہم جنسی میں مبتلا مرد کہتے ہیں کہ ان کے لئے عورت سے ہم بستری کا خیال بھی قابل نفرت ہے اور عورت کی شرمگاہ کے بوسے کا خیال بھی ان میں نفرت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ لوگ مردوں کی شرمگاہوں

پر کام ذہن کا استعمال کر کے ان کو منزل کرنے یا ان کی مقصد کو چاٹنے، جیسی حرکات
کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

مندرجہ بالا حقائق پر نظر ڈالنے کے بعد اپنے ملک کے ان نیم تعلیم یافتہ لوگوں (نیم تعلیم یافتہ اس لئے کہ ان کی اکثریت صرف مشین کے طور پر یا روپیہ کمانے کی غرض سے تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ورنہ نہ ان کو علم کا ذوق ہوتا ہے۔ اور نہ کتابوں کا۔) کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جن کی ایک بڑی تعداد مغربی افکار کو وحی الٰہی سے بھی بلند درجہ دے کر ان کے پیچھے اندھا دھند اور دیوانہ وار دوڑتی چلی جارہی ہے۔ اور رفتہ رفتہ ذہنی غلامی کی انتہا تک پہنچ چکی ہے۔ اسی طرح کی ایک صاحبہ نے یہ چند ماہ انگلینڈ میں گزار آئی تھیں، انگریزوں کے دفاع میں ایک مرتبہ فرمایا: کہ "وہ لوگ سور کھاتے ہیں، لیکن وہ سوروں کو غلاظت نہیں کھانے دیتے۔" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں لاکھوں مویشی ان سوروں سے ہی FOOT AND COLT کی وبائی بیماری میں مبتلا ہو کر مرتے ہیں۔ تاہم اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ وہاں کے سور STERILIZED کھانا اور پانی استعمال کرتے ہیں تو بھی اس سے سور کی فطرت تھوڑی بدل جاتی ہے؟ اگر کسی بلی کو صرف دودھ پلا کر پالا جائے تو کیا اس کی گوشت خوری کی فطرت ختم ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ اسے جب بھی موقع ملے گا وہ اپنی اس فطرت کا آزادانہ استعمال کرے گی۔

پاکستان کے مشہور صحافی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ہمیں ایک محفل میں بتایا کہ ایران کا شمار اگرچہ اسلامی ممالک میں ہوتا ہے۔ تاہم وہاں بھی خنزیر خوری اس قدر عام ہے کہ جب ہم شاہ کی تاج پوشی کی رسم کے موقع پر ایران گئے تو اس مختصر سے عرصہ میں بھی باوجود نہایت احتیاط کے تین مرتبہ غلطی سے سور کا گوشت چکھنے میں گرفتار ہوئے ——— ایک ایران ہی کا ذکر کیا، دوسرے کئی اسلامی ممالک بھی مغرب کی نقالی میں اس درجہ ملوث ہیں۔ (محدث۔ لاہور) ■■

بقیہ: المیہ مشرقی پاکستان:

کی تو مغربی بازو کا شیرازہ بھی بکھر جائے گا ——— خوف اور نفرت کی وجہ سے ہی اسے کبھی امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر رہتی ہے تو کبھی چین کی، کبھی روس کو دوست بنانے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی برطانیہ کو۔ یہ طاقتیں اسے ہتھیار دیکر اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں۔ اگر نفرت اور خوف کا جذبہ نہ ہوتا تو ہندوستان اور پاکستان دوست اور ہمدرد بنکر دوسرے ملکوں کی مدد کرنے کے قابل ہو گئے ہوتے۔

(بشکریہ الفرقان۔ فروری ۱۹۷۲ء)

سید شریف جرجانی
اور
علامہ تفتازانی

مولانا لطافت الرحمن۔ جامعہ اسلامیہ
بہاولپور

پیش لفظ: یوں تو میں نے الحق کے لئے ذیل کا مضمون فوائد بہیہ سے ترجمہ کرکے ضروری تغیر و تبدل اور اختصار و تطویل کے ساتھ علامہ سید شریف کے مختصر حالات قلمبند کرنے کی خاطر لکھنا چاہا تھا۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ عنوان بالا کے دونوں جلیل القدر علمی ہستیوں کے درمیان معاصرت بالفاظ دیگر منافرت ہے۔ اور اول الذکر کے حالات میں آخرالذکر کا ذکر آہی گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ دونوں علامے علمائے دیوبند کی سند علوم میں داخل ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی سند اساتذہ میں موجود ہیں۔ (القول الجمیل) جس کے تحت مناسب تو یہ تھا کہ میں ہر ایک پر الگ الگ مضمون لکھ دیتا۔ لیکن ایک دونوں کے اختلاط احوال اور کچھ میری سستی اور تساہل نے دونوں کو ایک مضمون میں جمع کر دیا۔

سید شریف: آپ کا نام علی بن محمد لقب سید شریف اور سید السند ہے۔ ۲۲ شعبان ۷۴۰ھ کو جرجان (استرآباد) طاغو نام بستی میں پیدا ہوئے۔ اور بنا بقول سخاوی ۶ ربیع الآخر ۸۱۶ھ کو شیراز میں ۷۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔

نہایت بلند پایہ فصیح العبارۃ اور دقیق الاشارت علامہ روزگار اور تمام علوم و فنون کے بحر ذخار تھے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ بحث و مناظرہ میں بھی بے مثال تھے۔ کسب علوم کا آغاز علوم عربیہ سے کیا اور بچپن ہی میں وافیہ شرح کافیہ اور اس کے بعد نحو میر لکھی۔ پھر آگے چل کر علوم عقلیہ نقلیہ سب کے امام بنے۔ کفوی نے کہا ہے کہ سید نے دوران تحصیل شرح مطالعہ سولہ بار پڑھی، لیکن اس خیال سے کہ مصنف سے بھی پڑھی جائے، علامہ قطب الدین کے پاس ہرات گئے

علامہ کی عمر اس وقت ۱۲۰ سال ہو گئی تھی۔ نہایت ضعیف تھے۔ آنکھوں پر سے لٹکے ہوئے ابروؤں کو اٹھا کر دیکھا تو نوجوان طالب علم (سید شریف) کا حلیہ اور قیافہ اس عظیم شخصیت کا پتہ دے رہے تھے جو اس میں ابھرنے والی تھی گویا ؎

بالا ئی سرش ز ہوش مندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

اس وجہ سے انہوں نے اپنے شاگرد مبارک شاہ منطقی کے نام خط لکھ کر سید کو اس کے پاس مصر بھیجا جو وہاں مدرس تھا۔ اور علامہ قطب الدین کا شاگرد خاص اور غلام تھا۔ اس کی تربیت اور تعلیم کا انتظام علامہ نے کیا تھا۔ اور اپنے سارے علوم اس کو پڑھا چکے تھے۔ سید شریف نے جب استاد "قطب الدین" کا خط شاگرد "مبارک شاہ" کو دیا تو اس نے خط چوم لیا اور سید سے کہا کہ تمہارے لئے الگ وقت اور مستقل سبق کی تو گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس کو شرح مطالعہ کے اس بجالو خصوصی درس میں شرکت کا اذن دیا۔ جو مصر کے بڑے لوگوں کے بیٹوں کو وہ خاص طور پر دیا کرتا تھا۔ سید اس پر رضامند ہوا اور خاموشی سے شرح مطالعہ کا وہ درس سن کر اسی پر اکتفاء کرتا رہا۔ مبارک شاہ صاحب کا گھر مدرسہ کے متصل تھا۔ ایک بار رات کے وقت وہ مدرسہ میں آیا تو سید شریف اپنا درس اور سبق یوں دہرا رہا تھا۔ کہ قال الشارح کذا وقال الاستاذ کذا وانا اقول کذا۔ اور اس گردان و بیان میں وہ نہایت دقیق و باریک نکات و مسائل بیان کرتا رہا۔ مبارک شاہ صاحب شاگرد کی اس عظیم قابلیت سے وجد میں آیا بہت ہی خوش ہوا اور پھر سید کو مستقل پڑھنے، سوال کرنے وغیرہ ہر طرح کی مراعات دیدی گئی۔ اس دوران میں سید نے شرح مطالعہ پر حاشیہ کا مسودہ تیار کر لیا۔ اور شرح مطالعہ کے علاوہ مبارک شاہ سے اپنے استاذ قاضی عضد الدین کی کتاب "مواقف" بھی پڑھ لی جس پر بعد میں شرح مواقف لکھ چکے ۔۔۔۔

سید نے طالب علمی کے دوران سید جمال الدین ابن محمد اقسرائی شارح موجز (طب) کی شہرت سننے پر اس کی کتاب شرح الایضاح دیکھ کر اس کو ناپسند کیا اور جب طلبہ نے کہا کہ کتاب کو تو آپ نے ناپسند کیا مگر ان کا درس سنیں گے تو پسند آئے گا۔ وہ درس سننے کی غرض سے چل پڑے لیکن ملاقات سے قبل وہ وفات پا گئے تھے۔ اس کے بعد شمس الدین محمد فناری ساتھ ہوا۔ اور وہ دونوں مصر گئے۔ وہاں اکمل الدین بابرتی صاحب العنایہ حاشیہ الہدایہ سے علوم شرعیہ کا درس لیا جس میں ان دونوں کے ہمراہ قاضی سماوہ محمود بن اسرائیل صاحب جامع الفصولین

اور حاج پاشا صاحب التسہیل بھی تھے۔ صاحب تسہیل نے سید کے ساتھ مل کر مبارک شاہ سے شرح رسالہ شمسیہ اور شرح مطالعہ پڑھی تھیں۔

سید اور تیمور | سید صاحب جب تمام علوم کی تحصیل وتکمیل کر چکے تو ملک شیراز میں اقامت پذیر ہو کر درس و تدریس اور علمی اشغال میں لگ گئے تو اس دوران میں سلطان تیمور بلاد شیراز پر حملہ آور ہوا ——— اور وہاں قتل و غارت ہوتی رہی۔ سلطان کے ایک علم دوست وزیر کی سفارش پر سید صاحب کو امان مل گئی۔ اور خود سلطان بھی اس کے علم و فضل اور علمی کمالات سے متاثر ہو کر اس کو اپنے ساتھ سمرقند لے آیا۔ جہاں سید صاحب تدریس میں مشغول ہوئے۔ سمرقند سلطان تیمور کا دار السلطنت تھا۔ جس کے متعلق صاحب منجد تجدید لکھتا ہے۔ اتخذہ "تیمورلنک" سمرقند عاصمۃ لہ وجاء الیہا بالعمال والفنانین والعلماء فازدھرت علی ایامہ۔

امیر تیمور ۱۳۳۶ء کو سمرقند کے قریب مقام کش میں پیدا ہوا۔ اور ۱۴۰۵ء کو وفات پا گیا۔

سید اور علامہ تفتازانی | سید کو ایک بار علامہ تفتازانی کے ساتھ یوں سابقہ پڑ گیا تھا۔ کہ تکمیل علوم کے بعد جب وہ شاہ شجاع الدین مظفر سے ملاقات کے لئے چلا گیا جب کہ وہ قصر زرد میں اقامت پذیر تھا۔ وہاں دیکھا کہ علامہ تفتازانی سلطان شجاع الدین کے پاس جا رہے ہیں۔ تو سید صاحب نے علامہ سے کہا کہ میں تیر اندازی وغیرہ حربی امور کا ماہر ہوں۔ آپ بادشاہ سے میری ملاقات کرا دیں۔ چنانچہ علامہ کے ذکر کرنے پر اس کی باریابی ہوئی۔ بادشاہ نے اس سے متذکرہ فنی مہارت کی بابت معلوم کیا تو سید نے بغل میں دبائے ہوئے کاغذات نکالے جن میں علماء اور مصنفین پر جرح و قدح اور اعتراضات کی صورت میں تیر اندازی کی گئی تھی۔ اور سلطان کے آگے رکھ کر کہا کہ یہ میرے تیر ہیں اور یہی میری وہ صنعت اور پیشہ ہے۔ جس کا ذکر علامہ تفتازانی فرما چکے ہیں۔ سلطان مظفر چونکہ خود علم شناس اور عالم پرور تھا۔ اسی وجہ سے اس نے صورت حال معلوم کر کے سید صاحب کا بہت اکرام و احترام کیا اور اپنے ساتھ شیراز لے گیا اور وہاں اس کو دار الشفاء کی تدریس پر مقرر کر دیا۔ جہاں وہ دس سال درس و افادہ میں مشغول رہا۔ ازاں بعد امیر تیمور نے ۷۸۹ھ میں شیراز فتح کیا تو اس کو اپنے ساتھ سمرقند جانے پر مامور کر دیا۔ سمرقند میں جب امیر تیمور کا انتقال ہوا تو سید واپس شیراز چلا گیا۔ اور وہاں ۸۱۶ھ میں علوم و کمالات کا یہ بحر ناپیدا کنار وفات پا گیا۔ رحمہ اللہ وایانا وجعل الجنۃ مأواہ ومأوانا۔

علامہ تفتازانی سے سید کو دوسرا سابقہ یہ پڑا کہ جب ان کو امیر تیمور اپنے ساتھ سمرقند لے

آیا تو اس وقت اگرچہ علامہ تفتازانی شاہی مجلس علما کے صدر الصدور تھے۔ لیکن سلطان تیمور کا رجحان سید کی طرف بڑھ گیا۔ اور کہا کہ علامہ تفتازانی اور سید شریف کا علم برابر سہی لیکن سید کا نسب تو پھر بھی موجب ترجیح ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے اس ترجیحی سلوک و برتاؤ پر سید کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ علامہ تفتازانی اور ان کے درمیان علمی مناظرات اور مباحثات ہونے لگے۔ جن میں سید کی جانب سے علامہ پر الزام و انجام کا پہلو غالب رہا۔ تاآنکہ ایک بار دونوں آیت کریمہ : اولٰئک علٰی ھدًی من ربھم۔ پر صاحب کشاف کے کلام میں یہ بحث چھڑ گئی کہ یہاں استعارہ تبعیہ ہے یا استعارہ تمثیلیہ۔ جس کے حکم نعمان الدین خوارزمی معتزلی نے سید کے قول کو ترجیح دی اور علامہ اپنی اسی علمی شکست کی شہرت سے نہایت رنجیدہ ہو کر تھوڑے عرصہ بعد سمرقند میں دوشنبہ کے روز ۲۲ محرم ۷۹۲ھ کو وفات پا گئے۔ پھر اس کی میت کو سرخس منتقل کیا گیا۔ جب کہ یہ مناظرہ ۷۸۱ھ میں ہو گیا تھا سید اور علامہ کے درمیان وہ مناظرہ جو علامہ کے حق میں اندوہناک صورت حال پر منتج ہوا ہے۔ وہ یہی درج بالا ہے۔ جس کو مولانا عبدالحیؒ نے فوائد بہیہ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن حضرت الاستاد المعظم جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے حاشیہ توضیح کے مختصر مقدمہ میں علامہ تفتازانی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بلفظہ یہ ہے:

"واتصل الی السلطان الشھید تیمور لنگ وکان عندہ بمکانۃ وفی مجلسہ جرت المناظرۃ بینہ وبین السید شریف الجرجانی فی ان الانتقام سبب الغضب ام الغضب سبب الانتقام فکان العلامۃ قائلاً بالاول والثانی بالثانی وکان الشیخ ابو منصور الکاذرونی حکما بینھما ورجح قول السید شریف فاغتم العلامۃ لاجلہ غماً شدیداً قیل انہ کان سبب موتہ وقد فات رحمۃ اللہ ۷۹۲ھ کذا ذکرہ فی التاج۔"

بہر کیف دونوں واقعے درست ہو سکتے ہیں۔ اور دونوں حکم بھی بلکہ اسی طرح کے تو بہت سے مواقع پیش آئے ہوں گے۔ جن سے علامہ تفتازانی نے سید کے علمی مقام کے علاوہ اس کی درباری سطوت و رفعت کے آگے ہتھیار ڈالا ہو گا۔ اور خود اسکی علمی حمیت و عزت نے فیصلہ کیا ہو گا۔ کہ اب تو "بطن الارض خیر من ظھرھا۔"

اور یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ سلاطین کی مجلس میں اس قسم کے حادثات کا آنا، تاریخ عالم کا ایک مستقل باب ہے۔ پھر یہاں تو علامہ کے مقابلہ میں سید شریف جیسی ایک بہت بڑی شخصیت ہے۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ سلاطین وقت کے یہاں بعض عالم نما جاہل بھی لطائف الحیل

سے حکمرانِ وقت کے خصوصی مذاق کا شریک کار یا معاون بن کر قربِ شاہی حاصل کر لیتے ہیں، اور پھر وہ بڑی بے رحمی اور دنائت سے وقت کے علماء و فضلا کی اس حد تک تحقیر و تذلیل کرتے ہیں کہ بعض بے چارے وطن اصلی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بس یہی دنیا ہے، اور یہی اس کا چکر ہے۔ متنبی نے خوب کہا ہے ؎

لحا اللّٰہ ذی الدنیا مناخا لراکب
فکل بعید الھم فیھا معذب

تصانیف | علامہ سید شریف کی تصانیف کا شمار پچاس سے زیادہ ہے۔ جن میں چند درج ذیل ہیں۔ تفسیر الزہراوین۔ شرح الفرائض السراجیہ۔ شرح المواقف۔ شرح مفتاح۔ شرح تذکرہ طوسی۔ شرح الجغمنی۔ شرح الکافیہ۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی۔ حاشیۃ المشکوٰۃ۔ خلاصۃ الطیبی۔ حاشیۃ المطول۔ حاشیۃ المختصر۔ شرح الطوالع۔ شرح ہدایت الحکمۃ۔ شرح حکمۃ العین۔ شرح حکمۃ الاشراق۔ شرح نقرہ کار للکافیہ متوسط۔ خمسی عوامل جرجانیہ رسالہ فی الوضع شرح شکل الاشارات للطوسی۔ النصاب فی نحو العجم۔ متن اشکال التاسیس۔ شرح تحریر اقلیدس۔ قصیدہ کعب بن زہیر۔ صرف بہائی۔ نحو میر۔ رسالہ فی الموجود بحسب القسمۃ العقلیہ۔ رسالتان فی الحرف والظروف۔ کبریٰ فی المنطق، فارسی۔ رسالہ فی مناقب خواجہ نقشبندیہ۔ رسالہ فی الوجود والعدم۔ رسالہ فی الافاق والانفس۔ رسالہ فی الادوار۔

سید کا مذہب | مولانا عبدالحی صاحبؒ نے اس بات پر علماء کا اتفاق نقل کیا ہے کہ علامہ سید شریف حنفی المذہب تھے۔ البتہ ان کے معاصر اور حریف علامہ تفتازانی کے فقہی مذہب میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے۔ جن چند لوگوں نے ان کو حنفی بتایا ہے۔ ان میں ایک تو شیخ زین بن نجیم مصری ہے جس نے اس کو اپنی کتاب فتح الغفار شرح المنار کے دیباچہ میں حنفی کہا ہے۔ اور اسی کو طحطاوی نے اپنے حواشی علی الدر المختار میں نقل کر کے کہا ہے: التفتازانی نسبۃ الی تفتازان بلدۃ بخراسان ولد فیھا فی صفر سنۃ ۷۲۲ھ وتوفی یوم الاثنین الثانی والعشرین من المحرم سنۃ ۷۹۲ھ بسمرقند ونقل الی سرخس وکان حنفیا کما ذکرہ صاحب البحر فی دیباجۃ شرح المنار وانتھت الیہ ریاسۃ الحنفیۃ فی زمانہ حتی ولی فقھاء الحنفیۃ۔

اسی طرح ملا علی قاری نے بھی اس کو طبقات الحنفیہ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی علامہ قاری سے

ایک غلطی ہوگئی ہے۔ کہ اس نے باپ کے نام کو اس کا نام بتایا ہے اور اس کے نام کو اس کے باپ کا نام بتایا ہے۔ چنانچہ وہ حرف عین میں لکھتے ہیں۔ عمر بن مسعود سعد الدین التفتازانی لہ التالیفات الدالۃ علی مزید فطنتہ وذکاوہ ومزید فہمہ وارتفاعہ۔ بہرصورت علامہ تفتازانی کے مذہب کے بارہ میں یہ موقف صحیح نہیں ہے۔ ہاں چونکہ فقہ اور اصول فقہ حنفی میں بھی ان کی تصانیف موجود ہیں۔ اس وجہ سے ان حضرات کو دھوکہ ہوگیا ہے۔ حالانکہ وہ شافعی المذہب تھے — صاحب کشف الظنون نے اس کو کئی جگہ شافعی المذہب بتا دیا ہے۔ چلپی نے بھی مطول کے حاشیہ پر بحث متعلقات الفصل میں کہا ہے۔ کہ شارح علامہ تفتازانی شافعی تھے۔ اور کفوی نے بھی سید کے ترجمہ کے ضمن میں کہا ہے۔ وکان التفتازانی من کبار علماء الشافعیۃ ومع ذالک لہ آثار جلیلۃ فی فقہ الحنفیۃ وکان من محاسن الزمان لم تر العیون مثلہ فی الاعلام والاعیان وھو الاستاذ علی الاطلاق والمشار الیہ بالاتفاق والمشہور فی ظہور الآفاق المذکور فی بطون الاوراق الخ آخر ما قالہ فی فضلہ وعلوہ واستفادۃ السید من تصانیفہ ووقوع المشاجرات والمناظرات بینہما فی مجلس تیمور الامیر المارعن ذکرہ فی ہذہ المقالۃ عن قریبا۔

جلال الدین سیوطی نے بھی بغیۃ الوعاۃ میں کہا ہے۔ مسعود بن عبداللہ الشیخ سعد الدین التفتازانی الامام العلامہ عالم بالنحو والتصریف، والمعانی والبیان والاصلین والمنطق وغیرہا شافعی۔ مولانا عبدالحیؒ نے فوائد بہیۃ میں علامہ تفتازانی کے متعلق حافظ ابن حجر کا وہ نوٹ بھی نقل کیا ہے۔ جس میں حافظ فرماتے ہیں کہ علامہ تفتازانی نے قطب الدین اور عضد الدین سے علم حاصل کیا اور تمام علوم میں ماہر اور مشہور ہوئے۔ لوگوں کو اس کی تصانیف سے بہت فائدہ ہوا، پھر اس کی چند کتابوں کا ذکر کرکے آخر میں فرمایا ہے۔ وکان فی لسانہ لکنۃ وانتہت الیہ ریاسۃ العلوم بالشرق ماتت بسمرقند احدی وتسعین وسبعمائۃ سنہ ۷۹۱ھ ابن الخطیب قاسم الرومی اور کفوی نے علامہ تفتازانی کے مختصر حالات، ولادت ووفات کے علاوہ اس کی تصانیف کے مشہور وسنین بھی قلمبند کئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ تفتازانی کی ولادت سنہ ۷۲۲ھ میں ہوئی۔ ماہ شعبان سنہ ۷۳۸ھ میں شرح زنجانی سے فارغ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ مطول شرح تلخیص کی تصنیف سے ماہ صفر سنہ ۷۴۲ھ کو ہرات میں فارغ ہوئے۔ مختصر المعانی کی تصنیف سے سنہ ۷۵۶ھ کو غجدوان میں فارغ ہوئے۔ شرح رسالہ شمسیہ سے ماہ جمادی الآخر سنہ ۷۵۲ھ کو مزار جام میں اور ذی قعدہ

باقی صـ۲۶ پر

ماہنامہ الفرقان اور نقیب کے اداریئے

بھارت کے مسلمان رہنماؤں کے تاثرات

المیہ مشرقی پاکستان

مسلمانوں کے بگاڑے ہوئے ذہن کی اصلاح نہ کر سکنے کا نتیجہ

★

سقوطِ مشرقی پاکستان پر بھارت کے ممتاز مسلمان علماء اور رہنماؤں کے تاثرات کا کچھ اندازہ پیشِ نظر دو اداریوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ پہلا اداریہ معروف ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کا ہے۔ شہرۂ آفاق عالم حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کا لکھا ہوا — دوسرا اداریہ معاصر نقیب پھلواری پٹنہ کا ہے۔ "س"

★

گذشتہ مارچ سے جب سے کہ مشرقی بنگال میں ان خونیں واقعات کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو بالآخر ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ کا باعث بنے اور پھر جس کے نتیجہ میں مشرقی بنگال کا تعلق پاکستان سے ختم ہو گیا۔ راقم سطور کو تحریک پاکستان کے اس طوفانی دور کے، جو اس وقت کے وائسرائے ہند ویول کی بلائی ہوئی کانفرنس (۱۹۴۵ء) کے بعد سے شروع ہوا تھا۔ بعض تکلیف دہ واقعات اور مناظر اس طرح یاد آتے رہے گویا کہ وہ اب آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں۔

اس وقت جداگانہ انتخاب رائج تھا۔ عام مسلمان جن کی غالب اکثریت سیاسی فہم و شعور سے بالکل خالی تھی (اور دین کے علم و عمل کے لحاظ سے بھی جن کا حال ایسا ہی تھا مگر اسلام کے نام سے ایک گہرا جذباتی تعلق رکھتے تھے۔) ان کی حمایت اور ان کے ووٹ تحریک پاکستان کے حق میں حاصل کرنے کے لئے پاکستان کی جدوجہد کو ایک "مقدس جہاد" بنا دیا گیا تھا، اور عوام کے دلوں میں صرف نعروں اور جلوسوں کے ذریعہ ایسا جوش بھر دیا گیا تھا کہ وہ اس کے نتائج و ثمرات اور منافع و مضرات کو سمجھنے کے لئے کسی بات کے سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہی

نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ پاکستان کی حکومت لا الہ الا اللہ کی عملی تفسیر اور اس بیسویں صدی کی دنیا کے لئے "اسلامی حکومت" اور "خلافت اسلامیہ" کا نمونہ ہوگی اور وہاں قرآن کی حکمرانی ہوگی اور تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے شہری و ملی حقوق کی بھی وہ محافظ ہوگی۔

یہ لوگ اس وقت اتنی موٹی بات سمجھنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کہ آج کی دنیا میں کوئی ملک دوسرے ملک کے شہریوں کا محافظ نہیں بن سکتا، اور کسی ملک کے شہری دوسرے کسی ملک سے ایسا رابطہ نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر ایسا کریں گے تو اپنے لئے مزید سنگین مشکلات پیدا کریں گے۔

اور اس سے بھی موٹی اور کھلی آنکھوں نظر آنے والی اس حقیقت پر غور کرنے کے لئے بھی یہ بیچارے اس وقت تیار نہیں تھے کہ جو لوگ تحریک پاکستان اور اس کی علمبردار مسلم لیگ کے صف اوّل کے قائدین تھے۔ ان میں سے بہت سوں کا دین سے تعلق بظاہر برائے نام سا ہی تھا۔ انہوں نے اپنی ذات اور اپنے گھرانہ پر بھی حکومت کرنے کی اجازت کبھی اسلام اور اس کی شریعت کو نہیں دی تھی، ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلامی نصب العین کے مطابق حکومت قائم کریں گے اور وہاں شریعت کی حکمرانی ہوگی، زانیوں اور شرابیوں کو درے مارے جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ ببول کے درخت سے آم اور املی کے درخت سے امرود حاصل کرنے کی امید سے کم عجیب بات نہیں تھی [1] لیکن بیچارے عام مسلمانوں اور خاصکر نوجوانوں کو ایسا ہی دیوانہ بنا دیا گیا تھا کہ وہ اس پر پورا یقین رکھتے تھے۔

---

[1] اس موقع پر بے اختیار ایک واقعہ ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جو اسی زمانہ میں (یعنی اب سے ۲۷-۲۸ سال پہلے) عبرت آموزی کے لئے "الفرقان" میں شائع کر دیا گیا تھا۔ یہاں اسی سے نقل کیا جا رہا ہے۔ "پنجاب کے میرے ایک دوست جو ہر طرح ثقہ اور قابل اعتماد ہیں اور دنیوی جاہ و منصب کے لحاظ سے بھی بہت بلند مقام ہیں۔ اور سیاسی مسلک کے لحاظ سے مسلم لیگی یا مسلم لیگ سے قریب تر ہیں، خود انہوں نے راقم سطور سے اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ مسلم لیگ کے ایک لیڈر اعظم سے انہوں نے ایک ملاقات میں نماز کے لئے کہا اور نماز کی دینی اہمیت ان پر واضح کی۔ سب کچھ سننے کے بعد ان لیڈر اعظم صاحب نے کسی قدر برافروختہ ہو کر انگریزی میں فرمایا۔ "کیا وقت کا تقاضا

پھر یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ملک کی تقسیم کو غلط اور بحیثیت مجموعی مسلمانانِ ہند کے لئے نقصان رساں یقین کرتے ہوئے اس کی سخت مخالفت کرنے والے مسلمانوں میں سے ان کے اکثر وہ علمائے دین تھے جو دین سے علمی اور عملی تعلق میں امتیاز رکھنے کے علاوہ اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے قربانیوں کے لحاظ سے بھی اپنی ایک خاص تاریخ رکھتے تھے اور مسلمانوں میں سیاسی حرکت و بیداری کے آغاز ہی سے وہ سیاست کے میدان میں تھے، ان کی زندگیوں کا خاصہ حصہ انگریزی اقتدار کے خلاف لڑتے ہوئے جیلوں میں گزرا تھا۔ اور کم سے کم ملک کے پڑھے لکھے مسلمان اس کو جانتے تھے۔ لیکن اس وقت فضا ایسی بنادی گئی تھی کہ اللہ کی پناہ! مسلمانوں کا بڑا طبقہ ان کو بھی دشمنِ اسلام سمجھتا اور ان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

خود راقم السطور اس وقت بلکہ کئی سال پہلے سے سیاسی اور خاصکر الکشنی ہنگاموں سے عملاً بے تعلق رہنے کا فیصلہ کرچکا تھا، لیکن مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے نے خاصکر ان کے "تعلیمیافتہ" طبقہ نے اس الکشنی جنگ میں اسلامی تہذیب و شرافت، شرعی احکام، اخلاقی اقدار اور معقولیت و سنجیدگی کے تقاضوں کو متروک کرکے صرف جوش و جذبات کی رو میں بہنے اور پھر ہر نا کردنی کر گزرنے کا جو رویہ اپنا لیا تھا۔ اس سے سخت روحانی کوفت بھی تھی اور یہ فکر بھی تھی کہ اس نسل کا کیا انجام ہوگا۔ جس کو ملک و ملت کے بڑے بڑے مسائل کے بارہ میں بھی عقل و ہوش اور غور و فکر سے کام لینے کے بجائے اندھے جوش و خروش اور غنڈہ گردی کا عادی بنایا جارہا ہے۔ اس لئے اس صورتِ حال پر اپنے اضطراب اور فکر مندی کا اظہار کبھی کبھی الفرقان کے صفحات پر بھی ہوجاتا تھا اور شدتِ احساس سے اس کا انداز کبھی بہت تلخ بھی ہوجاتا تھا۔

نومبر ۱۹۴۵ء میں جبکہ چند روز کے بعد مرکزی اسمبلی کا الکشن ہونے والا تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ الکشنی مہم ہی کے سلسلہ میں بریلی تشریف لائے، ان کی اور ان کے رفقا کی رائے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ یہ تھی کہ ملک کی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مفید نہیں بلکہ سخت مضر

ان باتوں کے لئے ہے۔" اس جواب کے بعد بھی ہمارے ان مبلغ دوست نے بطرزِ حسن اپنی تبلیغ جاری رکھی اور ان کو بتلایا کہ اسلام میں نماز کی اہمیت دوسری تمام چیزوں سے زیادہ ہے اور آپ چونکہ قوم کے سب سے بڑے لیڈر ہیں اس لئے قوم بھی یہ چاہتی ہے کہ آپ نماز پڑھیں۔"

ان لیڈرِ اعظم نے یہ سب سننے کے بعد ایک خاص انداز میں فرمایا۔ "کیا مصطفےٰ کمال نماز پڑھتا تھا۔" (الفرقان۔ محرم ۶۵ھ صفحہ ۶)

ہو گی (جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ جیسے یوپی بہار وغیرہ (جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے مراکز ہیں اور اصل مسائل انہیں کے ہیں۔) تقسیم کے بعد ان کی مشکلات اور زیادہ بڑھ جائیں گی، اور جن صوبوں میں وہ اکثریت میں ہیں۔ وہاں تو وفاقی نظام حکومت میں اختیار و اقتدار بہر حال ان ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ اپنی اس دیانتدارانہ رائے کی بنا پر وہ مسلم لیگ کے مطالبۂ تقسیم کے مخالف تھے اور چونکہ فیصلہ کا دار و مدار مسلم سیٹوں کے الیکشن کے نتائج پر تھا اس لئے مسلمانوں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے اور اپنا ہم خیال بنانے کے لئے وہ پوری طرح سرگرم تھے۔ اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اور اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس مہم کے سلسلہ میں وہ ۲۰ / نومبر ۱۹۴۵ء کو بریلی بھی تشریف لائے، راقم السطور کا قیام اس زمانہ میں بریلی ہی تھا، الفرقان وہیں سے نکلتا تھا۔ شہر کے مرکزی مقام "کتب خانہ" کے پارک میں جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ بعد عشا کا وقت تھا۔ اس عاجز نے بھی جانے اور سننے دیکھنے کا فیصلہ کیا اور جلسہ گاہ کے قریب ایک ذرا بلند جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھنا سننا اپنے لئے زیادہ مناسب سمجھا۔ پھر جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ ایسا تھا کہ اگر میں خود نہ دیکھتا اور کوئی دوسرا بیان کرتا تو ہرگز یقین نہ آتا۔ جیسے ہی حضرت مولانا اور ان کے رفقاء جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی، مخالفین کے ان گروہوں اور ٹولیوں کیطرف سے جو پہلے سے جلسہ گاہ کے ارد گرد کھڑے تھے، مخالفانہ نعروں اور غنڈہ گردی کا ایک طوفان اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اپنا یہ مشاہدہ اور اس کے بارہ میں اپنا کچھ تاثر بھی اس وقت الفرقان میں لکھا گیا تھا۔ اس کی چند سطریں یہ ہیں:

> بدتمیزی اور حیوانیت کا ایک عبرتناک طوفان اور ہنگامہ تھا، کوئی دور سے جوتا دکھا رہا ہے۔ کوئی ہاکی اٹھا رہا ہے۔ کوئی پیپا بجا رہا ہے۔ کوئی کسی دوکان کے سائبان کا ٹین یا سین بورڈ پیٹ رہا ہے۔ کبھی سب مل کر تالیاں بجا رہے ہیں، کبھی جانوروں کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ پھر اس ساری غزل کا مقطع یہ تھا کہ جلسہ گاہ کے ارد گرد سڑک کی کٹائی کے لئے پتھروں کے جو ڈھیر لگے ہوئے تھے، پہلے تو جلسہ پر اکا دکا پتھر پھینکے گئے اور پتھروں ہی سے گیس کے ہنڈے توڑ کر اندھیرا کر دیا گیا۔ اور آخر میں چند ٹولیوں نے پتھر کے ان ڈھیروں پر کھڑے ہو کر اس قدر بے دردی کے ساتھ بے تحاشا پتھر برسائے کہ اگر یہ سب پتھر جلسہ ہی پر گرتے تو حاضرین میں سے شاید کوئی ایک بھی صحیح سالم نہ رہتا۔۔۔۔۔۔

بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہذب اور تعلیم یافتہ فیشنیبل صاحبزادوں کے لباس میں لایعقل حیوانوں کا ایک انبوہ ہے۔ جو اپنی انسانی حیثیت کو بالکل فراموش کر کے حیوانیت و درندگی کا یہ مظاہرہ کر رہا ہے۔

پھر اس تحریر کے آخر میں اس وقت کے قائدین مسلم لیگ کو مخاطب کر کے عرض کیا گیا تھا۔

"ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے کہ جن بیچارے جاہلوں، ان پڑھوں یا اسکولوں کالجوں میں تعلیم پانے والے جن نو خیز و ناتجربہ کار جذباتی نوجوانوں کے ذہن کو غلط تربیت دے کر آپ آج مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگوں کی بے عزتی کراتے ہیں۔ (دین و ملت کے لئے جن کی قربانیوں کی شاندار تاریخ بھی ہے۔) کل ایسا دن بھی آسکتا ہے۔ کہ یہ بگڑی ہوئی ذہنیت کسی اختلاف کے موقع پر خود آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی یا اس سے بھی بدتر برتاؤ کرے۔" (الفرقان۔ ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ)

بریلی کا یہ واقعہ تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے علاوہ اس دور میں یوپی، بہار اور پنجاب کے بہت سے مقامات پر خاصکر حضرت مولانا مدنی رح کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کے اس طرح کے واقعات بار بار ہوئے تھے۔ اسی طرح اسی زمانہ میں مولانا آزاد کے ساتھ جبکہ وہ کلکتہ سے دہلی کے لئے سفر کر رہے تھے علی گڑھ اسٹیشن پر جو کچھ کیا گیا تھا، اس کی شرمناک اور تکلیف دہ تفصیلات اخبارات میں آئی تھیں، بہت سوں کو اب تک یاد بھی ہوں گی۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی تحریک جسطرح چلائی گئی تھی اس نے مسلمانوں اور خاصکر نوجوانوں کی تفکر اور عاقبت اندیشی کی صلاحیت اور سنجیدگی و متانت کو کتنا برباد کیا، اخلاقی معیار کو کتنا گرایا اور کس قدر غلط تربیت کی۔ اور پھر کبھی اس بگاڑ کی اصلاح کی فکر نہیں کی گئی۔

جو شخص بھی پاکستان کے قیام خاصکر لیاقت علی خاں مرحوم کے سیاسی قتل سے لے کر اس وقت تک کے وہاں کے افسوسناک اور المناک واقعات و حوادث پر گہری نظر ڈالے گا وہ محسوس کرے گا۔ کہ قوم کا جو ذہن پاکستان کی جد و جہد میں بگاڑا گیا تھا اور تفکر و مفاہمت اور تعمیری نقطہ نظر کی بجائے تخریب و تصادم، غنڈہ گردی اور زور دستی کا جو مزاج بنایا گیا تھا وہ جوں کا توں باقی رہا بلکہ بعد میں آنے والی نسل کو بھی میراث میں ملا، اور اس کے تلخ نتائج مختلف شکلوں میں وہاں ظاہر ہوتے رہے ہیں اور اب سب سے آخر میں مرحوم مشرقی پاکستان میں بنگالی مسلمانوں نے اپنے غیر بنگالی مسلمان بھائیوں کے ساتھ اور پھر غیر بنگالی مسلمانوں نے اپنے مسلمان بنگالی بھائیوں کے ساتھ جو کچھ کیا اور اب اس کے

جواب میں جو کچھ ہو رہا ہے اور زیادہ تر اسکولوں، کالجوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ وہ اصولی اور بنیادی طور پر وہی ہے۔ جس کا عادی ان کو تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بنایا گیا تھا۔ وہ اس کی ابتدا تھی اور یہ اس کی انتہا ہے۔ دوسرے اقتصادی، معاشی اور سیاسی عوامل و محرکات سے انکار نہیں لیکن اگر ذہنیتوں میں وہ فساد نہ ہوتا تو اختلافات کا انجام ہرگز یہ نہ ہوتا۔

اس موقع پر دلی دکھ کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ کہ اگرچہ قیام پاکستان کے پہلے دن سے سورج کی روشنی کی طرح یہ بات برابر ظاہر ہوتی رہی ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں اسلام کا نام لے کر جو کچھ باور کرایا گیا تھا۔ اور نادانی و سادہ لوحی سے جس پر یقین کر لیا گیا تھا۔ وہ صرف دھوکہ تھا، وہاں ایک دن کے لئے بھی اللہ کے دین اسلام کی حکومت نہیں ہوئی بلکہ وہ بے چارہ محکوم اور مظلوم ہی رہا اور ہے۔ اسی طرح وہاں کے ارباب اقتدار نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ وہی رویہ رکھا ہے۔ جو عموماً حکومتیں غیر ملکیوں کے ساتھ کرتی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے ہمیشہ ہماری مشکلات میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔ جسے ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے۔ جس کو اللہ نے ان باتوں کی کچھ سمجھ بوجھ دی ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں بھی مسلمانوں میں ایک اچھا خاصا طبقہ موجود ہے۔ جس کا ذہن ۲۵ سال کے اس تجربہ کے بعد بھی نہیں بدلا ہے۔ اور اسکی خوش فہمی و خوش اعتقادی اور جذباتیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔۔۔ اس کا سب سے بڑا ضرر یہ ہے۔ کہ یہ بے چارے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو کبھی صحیح روشنی میں نہیں دیکھ سکتے اور ان کے حل کرنے کے لئے کبھی صحیح راستہ نہیں اپنا سکتے، بلکہ اس کی راہ میں مشکلات ہی کا سبب بن رہے ہیں۔ (الفرقان لکھنؤ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ)

کیا ہم میں غلطی تسلیم کر لینے کی جرأت ہے۔؟

(جناب شاہد رام نگری۔ ایڈیٹر نقیب پھلواری شریف پٹنہ)

یہ دنیا مسلسل تبدیلیوں اور پیہم انقلابات کا نام ہے۔ اس کارخانۂ عالم میں نہ کسی شئے کو قرار و قیام ہے۔ نہ ثبات و دوام، ہر صبح کی مقدر میں شام ہے اور ہر شب تار نمود صبح کی نقیب و پیامبر، افراد کا معاملہ ہو یا قوموں کا کوئی بھی تغیر و تبدل کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ زندہ قومیں ہر لمحہ انقلابات کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ تبدیلیوں سے سراسیمہ ہونے کے بجائے وہ ان کو اپنی ترقی اور کامیابی و کامرانی کا زینہ بنا لیتی ہیں، تبدیلیوں کے خوف سے الگ تھلگ رہنا یا بے غمی اور بے حسی کی زندگی

پر قناعت کر لینا گویا جمود اور موت کو اپنے اوپر مسلط کر لینا ہے۔

اس برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔ تو اس میں کتنے ہی نشیب و فراز ملیں گے۔ کامیابیوں کے جشن اور کامرانیوں کے چراغاں کے ساتھ اس میں مایوسیوں اور نامرادیوں کے اندھیرے بھی ملیں گے، لیکن ملت اسلامیہ کا کارواں ہر موڑ پر اپنے نقش قدم چھوڑتے ہوئے رواں دواں ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں کے دوران برصغیر ہند و پاک میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن سے ہم مبہوت رہ گئے ہیں۔ ہماری آرزوں، تمناؤں اور امیدوں کے خلاف حالات کی ایک ایسی تصویر ابھر کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ جس کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے اپنے آپ کو رضامند کرنے میں ہمیں کافی دشواری محسوس ہو رہی ہے۔ فکری اور ذہنی طور پر ہمارے پاؤں اکھڑ گئے ہیں، لیکن ابھی تک ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس پسپائی کے بعد ہماری دوسری دفاعی لائن کہاں ہوگی، ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میدان میں ڈٹے رہو مایوسی گناہ ہے، لیکن تلوار ٹوٹ جانے کے بعد خالی میان سے کب تک بھرم قائم رہ سکے گا۔

کچھ عرصہ قبل انہیں اوراق میں ہم نے لکھا تھا۔ کہ ہر آغاز میں اس کا انجام پوشیدہ ہوتا ہے۔ پودا کیسا ہوگا، اس کا بہت حد تک انحصار بیج پر ہوتا ہے۔ اگر بیج میں خرابی ہوگی تو پودے میں بھی وہ خرابی ضرور نمایاں ہوگی۔ آج ۱۹۷۲ء میں جن حالات کا ہم کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ان کا بیج ۱۹۴۷ء میں ہی پڑ گیا تھا۔ اس وقت جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے ایک ایسا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ جو ایک طرح سے پسپائی کے مترادف تھا۔ اسلام نے ہمیں ساری دنیا میں پھیلنے بڑھنے اور شرق تا غرب چھا جانے کی بشارت دی، جب تک ہمارے اندر صحیح اسلامی روح کار فرما تھی۔ ہم خیر و برکت بن کر پھیلتے بڑھتے اور ساری دنیا پر چھاتے چلے گئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریز حاکموں نے ہمیں اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے اکثریت اور اقلیت کا ایک نیا فلسفہ ایجاد کیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم کم تعداد میں ہیں اس لئے زیادہ تعداد والے لوگوں سے ہماری تمام چیزوں کو خطرہ ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کم تعداد میں ہوتے ہوئے بھی اس سرزمین پر سات سو سال تک ہم حکومت اور سرداری کے منصب پر فائز رہے۔ انگریز حاکم ہمیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمیں اپنی پسندیدہ چیزوں کی حفاظت کے لئے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے۔ جہاں ہم غالب تعداد میں ہوں۔ یہ فلسفہ ایک زخم تھا۔ لیکن ہم نے اس کو مرہم سمجھ کر اپنے سینے سے لگایا اور زمین پر ایک مصنوعی لکیر کھینچ کر اس فریب کا شکار ہو گئے کہ اس طرف سب غیر محفوظ اور اس طرف سب کچھ محفوظ، اسپین کے ساحل پر کشتی جلانے والی قوم نے ایسی ٹھوکر پہلے کبھی نہیں کھائی تھی، لکیر کھینچنے کے بعد پتہ چلا کہ جتنے لکیر کے

اس پار بھی اس کے آدھے پھر بھی اس پار بچ گئے۔ ہم جس چیز کو مسئلے کا حل سمجھ رہے تھے۔ اس سے اور نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ پاکستان، سندھ، سرحد، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے لئے نہیں باقی صوبوں کی مسلم اقلیت کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، لیکن یہ مسلم اقلیت آج اسی پاکستان کے سینے پہ بار گراں بن گئی ہے۔ آج بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوج اسی مسلم اقلیت کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہے۔ اور ہمیں یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ کاش ایسی کوئی صورت پیدا ہو جاتی کہ یہ لوگ اپنے عزیز و اقارب اور اپنی جنم بھومی سے آملتے، بظاہر یہ ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں، کل تک ہمیں بنگلہ دیش کا قیام ناممکن نظر آتا تھا۔ آج وہ ناقابلِ تردید حقیقت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

آج ہمارے گرد و پیش جو حالات ہیں ان کو بدلا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو بدلنے کے لئے تیار ہوں، بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان غلطیوں کو محسوس کریں جو ہم نے پچھلے ٢٥ برسوں میں کی ہیں۔ دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ جب بھی غلطی کا احساس ہو جائے تو اس کو فوراً سدھار لیا جائے۔ اگر ہماری منزلِ مقصود مغرب میں ہے اور غلطی سے ہم مشرق کی طرف چل پڑے ہیں۔ تو خواہ کتنا ہی آگے نکل جائیں منزل سے دور ہی ہوتے جائیں گے۔ ٢٥ برس کے بعد کسی غلط فیصلے سے پلٹنا آسان نہیں۔ لیکن اس کے بغیر چارۂ کار بھی کیا ہے۔ ہمارے لاکھوں عزیز و اقارب جو مشرقی بنگال میں تھے۔ ان کی سلامتی کے لئے ہم چاہتے تھے۔ کہ پاکستان ٹوٹنے سے بچ جائے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان ٹوٹ گیا۔ دراصل پاکستان ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے اس کا دار و مدار ان لوگوں پہ تھا جن کے ہاتھوں میں پاکستان کی باگ ڈور ہے۔ وہ نااہل اور ناکارہ ثابت ہوئے۔ وہ پاکستان کو ثابت نہ رکھ سکے۔ کل بھی پاکستان کا جو کچھ ہونا ہے۔ اس میں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ ہوگا وہی جو وہاں کے لوگ چاہیں گے۔ اسطرح ہندوستان میں ہمارا مستقبل کیا ہوتا ہے۔ یہ خالصتہً ہمارے اوپر منحصر ہے۔

پاکستان خوف اور نفرت کی بنیاد پہ قائم ہوا تھا۔ اسی خوف اور نفرت نے پاکستان کو کھا لیا۔ جو ڈر انگریزوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندو اکثریت کے خلاف پیدا کیا تھا۔ اسی طرح کا ڈر پاکستان کی بنگالی اکثریت کو غیر بنگالی اقلیت سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے ڈر کے خاتمے کے لئے انہوں نے جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ کیا، لیکن جب فوجی حکمران جمہوری حقوق کا گلا گھونٹنے پہ تیار ہو گئے تو ڈر نے نفرت، اور تشدد کی شکل اختیار کر لی اور عوام نے ہتھیار اٹھا لیا۔ خوف اور نفرت منفی بنیاد ہے۔ اس بنیاد پر ایک مثبت قوم کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اگر پاکستان نے نفرت اور خوف کے زہریلے احساسات کو ختم کرنے کی کوشش نہ

باقی صفحہ ٥٩ پر

کچھ تلافیٔ مافات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

حضرت مفتی صاحب مدظلہم بحمد اللہ اب رو بصحت ہیں۔ آپ نے اپنی علالت کے دوران یہ مضمون تحریر کروا کر اپنے احباب اور متعلقین تک پہنچانے کی خواہش ظاہر فرمائی ہے۔ قارئین سے دعائے صحت کاملہ کی اپیل ہے۔ (ادارہ)

★

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد!

احقر اس وقت اپنی عمر کا ستترواں سال گزار رہا ہے، اور یوں تو انسان کی پوری زندگی ہی اس کام کے لئے ہے کہ اسے سفر آخرت کی تیاری میں صرف کیا جائے، کیونکہ اس سفر کے لئے جوانی یا بڑھاپے کی کوئی قید نہیں، کتنے بوڑھے ہیں جنہوں نے اپنے پوتوں پڑپوتوں کو مٹی دی ہے اور کتنے جوان ہیں جو اپنی اولاد بھی نہیں دیکھ پائے۔ لہٰذا واقعہ تو یہ ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں آخرت کی فکر سے غفلت برتی جا سکے۔ لیکن خاص طور سے بڑھاپے کی اس عمر کا سب سے بڑا مطالبہ انسان سے یہ ہے کہ اگر اس نے ماضی میں غفلت برتی ہے تو کم از کم اب وہ مکمل طور سے سفر آخرت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو جائے۔

سفر آخرت کی تیاری کے یوں تو بہت سے شعبے ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ سنگین معاملہ حقوق العباد کا ہے، کیونکہ وہ صاحب حق کی معافی کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس کے ذمہ کسی (مسلمان یا کسی دوسرے انسان) بھائی کا کچھ حق ہو اس کی آبرو کے متعلق یا اور کسی قسم کا، وہ اس سے آج معاف کرالے ایسے وقت سے پہلے کہ نہ اس کے پاس دینار ہوگا نہ درہم۔ (مشکوٰۃ باب الظلم)

اسی لئے میرے شیخ و مرشد اور مربی سیدی و سندی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

صاحب تھانوی ؒ نے شوال ۱۳۶۲ھ کے ماہنامہ "النور" میں (یعنی وفات سے تقریباً آٹھ سال پہلے) ایک مضمون "العذر والنذر" کے نام سے چھپایا تھا جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ اپنے ذمہ جو حقوق العباد رہ گئے ہوں ان کا تصفیہ کیا جائے۔

عرصہ سے میرا بھی ارادہ تھا کہ اس قسم کا ایک مضمون تحریر کر کے اپنے اعزہ، احباب اور متعلقین میں شائع کروں، لیکن گوناگوں مصروفیات میں یہ کام ٹلتا گیا۔ آج جبکہ دورۂ قلب کے حملہ کی وجہ سے میں تقریباً اٹھارہ روز سے ہسپتال میں زیرِ علاج ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے طبیعت کو رو بصحت کر کے اتنا افاقہ بخشا ہے کہ میں اپنا یہ مجوزہ مضمون لکھوا سکوں میں چاہتا ہوں کہ اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

حقوق العباد دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک مالی، دوسرے غیر مالی، جہاں تک مالی حقوق کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے کوشش ہمیشہ یہ کی ہے کہ اس قسم کے حقوق سے سبکدوش رہوں، اور جن کی ادائیگی باقی ہے، ان کا بحمد اللہ انتظام کر رکھا ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ کچھ حقوق میرے ذہن میں نہ رہے ہوں، لہٰذا اگر کسی صاحب کا کوئی مالی حق میرے ذمہ رہ گیا ہو جسے میں بھول گیا ہوں تو براہِ کرم وہ مجھے یاد دلادیں، اگر مجھے یاد آگیا تو انشاء اللہ اسکی ادائیگی کر دوں گا۔

رہے غیر مالی حقوق، مثلاً کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو، کسی کی دلشکنی کی ہو، خواہ روبرو یا پسِ پشت اور خواہ ابتداءً ایسا کیا ہو یا انتقام میں جائز حدود سے تجاوز ہو گیا ہو یا کسی کو ناحق بدنی ایذاء پہنچائی ہو (اور اس قسم کے حقوق کا احتمال زیادہ ہے) ان سب اہلِ حقوق کی خدمت میں دست بستہ نہایت لجاجت سے درخواست ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے معاوضہ لے لیں۔ (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے۔) اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرمادیں۔ میں دونوں حالتوں میں ان کا شکر گذار رہوں گا۔ کہ مجھ کو آخرت کے محاسبہ سے بری فرمایا۔ اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا۔ کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔

جن مسائل میں احقر کو دوسروں سے علمی نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے، ان میں اپنے شیخ و مربی سیدی و سندی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے مزاج کے مطابق احقر کا معمول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں نے اختلاف کو نظریہ، اصول اور مسلک تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اشخاص و ذوات کو اس کا ہدف بنانے سے حتی الوسع پرہیز کیا ہے۔ تاہم ان مسائل میں حدود کی رعایت آسان نہیں ہوتی، اس لئے ممکن ہے کہ کوشش کے باوجود کہیں حدود سے تجاوز ہو گیا ہو۔ اور

میرا قلم یا زبان کسی کی ناحق دل شکنی کا سبب بنی ہو، اس لئے جن حضرات سے میرا علمی، نظریاتی یا سیاسی اختلاف رہا ہے، ان سے بھی میری یہی درخواست ہے۔

حدیث میں کسی مسلمان بھائی کی معذرت قبول کر لینے اور اسے معاف کرنے کے بڑے فضائل آئے ہیں، بلکہ ایک حدیث میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ: "جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے اس پر ایسا گناہ ہوگا، جیسا ظلماً محصول وصول کرنے والے پر ہوتا ہے۔" (ابن ماجہ) اور ایک دوسری حدیث میں ہے، کہ "جس شخص سے اسکا بھائی معذرت کرے اور وہ اس کو قبول نہ کرے، وہ میرے پاس حوضِ کوثر پر نہ آنے پائے گا" (ترغیب وترہیب، منقول از العذر والنذر)

لہٰذا امید ہے کہ جن حضرات کے ایسے حقوق مجھ پر واجب ہیں۔ وہ ان احادیث کے پیش نظر ان شاء اللہ مجھے ضرور معاف فرما دیں گے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ کسی شخص کی غلطی معاف کرنے یا معذرت قبول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے دوستانہ اور خصوصی تعلقات بھی ضرور رکھے جائیں، کیونکہ ایسا کرنا بعض اوقات مشکل اور بعض اوقات خلافِ مصلحت ہوتا ہے، لہٰذا معافی کی اس درخواست کا مطلب دوستی، بے تکلفی اور خصوصی مراسم کی درخواست نہیں ہے، صرف حقوقِ شرعیہ سے سبکدوش کرنے کی درخواست ہے۔

اور جسطرح میں دوسروں سے معافی کا طلب گار ہوں، اسی طرح حدیثِ نبویؐ کے بموجب اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کی امید کرتے ہوئے اپنے وہ تمام غیر مالی حقوق بلا استثناء سب معاف کرتا ہوں جو کسی دوسرے مسلمان پر ہوں اور میرے جو مالی حقوق دوسروں پر واجب ہیں۔ اُن کے بارے میں یہ گذارش ہے کہ جن حضرات کو ادائیگی پر قدرت نہ ہو وہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کر لیں۔ ان شاء اللہ ان کے لئے کوئی آسان راستہ نکال دوں گا، خواہ معافی، خواہ تخفیف، خواہ مہلت، خواہ اور کچھ۔

آخر میں اپنے تمام اعزہ احباب اور متعلقین سے درخواست ہے کہ وہ احقر کو حتی الامکان دعاؤں میں یاد رکھیں۔

جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

احقر

(مفتی) محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ

۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ

جناب نور محمد غفاری۔ ایم۔ اے

مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست
کی
نمایاں خصوصیات

قسط ۲

اسلام نے مسلمان کو صرف یہ فکر ہی دے کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ غرباء کی کفالت کے لئے اس پر کچھ فرائض عائد کر دئیے۔ جن میں سب سے بڑا زکوٰۃ ہے۔ خذ من اموالھم صدقۃ الخ جس کا مقصد ہے:

تؤخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراءھم۔ (متفق علیہ)

تمہیں امراء سے لی جائے گی اور محتاجوں پر لٹا دی جائے گی۔

علاوہ ازیں کفارہ صوم، کفارہ حج، قسم توڑنے کا کفارہ صدقہ فطر، عشر، خیرات وغیرہ اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کیطرف اشارہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

مَنْ ترکَ مالاً فلورثتہٖ ومَنْ ترکَ کلاً فالینا۔ (بخاری ومسلم)

جو کوئی مال چھوڑ کر وفات پائے تو وہ اس کے ورثا کا ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (ریاست کے) ذمہ ہے۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

مَنْ ترکَ دیناً او ضیاعاً فلیأتنی فانا مولاہٗ (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑ کر مرے یا ایسے پسماندگان جن کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو وہ میرے پاس (اسلامی ریاست) آئے میں اس کا والی ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفالت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے۔ محض اس بنا پر کہ دولت مند اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے اس کی بازپرس کرے گا۔" (محلی لابن حزمؒ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث میں آیا ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک دولت مند شخص سے پوچھیں گے کہ میں بھوکا تھا، میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے انکار کر دیا۔ وہ عرض کرے گا اللہ تعالیٰ آپ تو رب العالمین ہیں، آپ کو میں کیسے کھانا کھلاتا تو ارشاد ہوگا۔ میرے ایک غریب بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے انکار کر دیا۔"

آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ مذہب غریب کی بھوک کو خدا کی بھوک سے تعبیر کرے اس کے نازل کردہ نظام معاش کو اپنانے والی ریاست کس درجہ فلاحی ہوگی۔؟

حضرت علامہ ابن قیمؒ آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور تعامل صحابہؓ کی روشنی میں ایک اصول وضع کرتے ہیں :

"اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جسطرح اس شخص کی وارث ہے جس نے ورثہ نہ چھوڑا ہو۔ اس طرح وہ اس کے قرض کو ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہوگی جبکہ وہ کوئی شئے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اسکی زندگی میں اسکی کفالت کی بھی ذمہ دار ہوگی جبکہ کوئی اسکی کفالت کرنے والا نہ ہو۔"

غرض اسلام نے ایسی فلاحی ریاست قائم کی کہ بقول علامہ طبریؒ حضرت امیر المومنین عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد میں لوگ زکوٰۃ کی رقمیں اٹھائے پھرتے تھے اور کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

مدینہ منورہ کی فلاحی ریاست کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم گفتگو "بیت المال" سے متعلق ہے۔ خلفاء راشدینؓ کے نزدیک بیت المال اللہ اور خلق اللہ کی امانت تھی، خلیفہ کی ذاتی ملکیت نہیں، وہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنا حرام سمجھتا تھا۔ بیت المال کی ساری رقم غربا، مساکین اور یتامیٰ پر خرچ کی جاتی تھی۔ خلفاء راشدینؓ کے عہد میں ایسے غرباء مساکین اور یتامیٰ جنہیں وظیفہ یا بیت المال سے کوئی رقم امداد کے طور پر دینا ہوتی تھی ان کے نام باقاعدہ رجسٹر میں درج کئے جاتے تھے۔ اور ماہوار یا سالانہ انہیں رقم ادا کی جاتی تھی ـــــــ تفصیل کیلئے

ملاحظہ فرمائیں "کتاب الاموال" لابی عبیدؒ ، نظام العالم والامم لطنطاویؒ جلد ۲ ، مقریزی ، طبری ، "تاریخ ابن کثیر ، اشہر مشاہیر الاسلام جلد ۲ ص ۳۶۴ اور کتاب الخراج لابی یوسف ص ۴۲ ۔

بیت المال کے سلسلہ میں اسلامی خلیفہ کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیے ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوتے ہیں ۔ مگر دوسرے دن کندھے پر کپڑے کا تھان ڈال کر بازار میں نکلتے ہیں ۔ سیدنا عمرؓ خلافت کی مصروفیات کا احساس دلا کر حضرت ابو عبیدہؓ خازن بیت المال کی خدمت میں لے جاتے ہیں ۔ اور وہ ایک عام آدمی کے معیار کے مطابق وظیفہ مقرر کرتے ہیں ۔ جو تقریباً ۴۰۰۰ درہم سالانہ تھا ۔ مگر جب مدت کا وقت قریب آیا تو وصیت فرمائی کہ میرے ترکے میں سے ۸ ہزار درہم بیت المال میں جمع کرا دیں ۔ جب یہ مال حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچا تو رو پڑے اور فرمایا :

"خدا ابوبکرؓ پر رحم فرمائے اس نے اپنے سے بعد آنے والوں کو مشکل میں ڈال دیا۔"

(کنز العمال جلد ۲)

جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو بیت المال میں ان کا کیا حصہ تھا جس کے متعلق تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"میں نے اپنے لئے اللہ تعالیٰ کے مال کو یتیم کے مال کے درجے میں رکھا ہوا ہے ۔ اگر بے نیاز ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا ۔ اور اگر حاجت مند ہوں گا تو دستور کے مطابق اپنی حاجت براری کروں گا ۔"

(فاروقِ اعظم ص ۵۸۹ از محمد حسین ہیکل)

ایک دوسرے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

"میرے لئے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے ۔ کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کیلئے اور ایک جاڑے کے لئے اور قریش کے ایک متوسط درجے کے شخص کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لئے لوں اور میں بھی تو مسلمانوں میں سے ایک آدمی ہوں ۔" (البدایۃ والنہایۃ جلد ۷ ص ۱۳۴)

حضرت عثمان غنیؓ تو بیت المال سے بے نیاز تھے ۔ خداوند قدوس نے دولت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا ۔ جسے اپنے عیال اور عیال اللہ پر بے دریغ خرچ فرماتے تھے ۔ بعض ناراست دوستوں نے ان پر الزام لگائے ، لیکن ہم ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے ہیں ۔

حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو وہی سادگی برقرار رکھی۔ موٹا جھوٹا کھاتے اور اکثر اوقات پیوند لگا کپڑا پہنتے تھے۔ تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پھٹی پرانی چادر پہنے بیٹھے ہیں اور سردی سے کانپ رہے ہیں۔ (ابن کثیر جلد ۸ ص۳)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عہد مبارک میں اپنی ساری جائیداد بیت المال میں جمع کرا دی۔ بعض اعزہ و اقارب نے جب دریافت کیا کہ اولاد کیلئے کیا چھوڑ کے جا رہے ہو؟ تو فرمایا: "اگر وہ متقی رہے تو خدا انہیں پالے گا۔ اور اگر بگڑ گئے تو پھر ان کے لئے بھوک ہی بہتر ہے۔" (سیرت عمر بن عبدالعزیز لعبداللہ بن عبدالحکیم متوفی ۲۱۴ھ)

الغرض ان حضراتؓ نے آنے والی نسلوں کے لئے ایسے شاندار عملی نمونے چھوڑے ہیں۔ جن کے اتباع میں حکومتوں کا استحکام اور عوام کی خوشحالی یقینی ہے۔ (فمن شاء فلیہ جع)

۴۔ داعی اور معلم ریاست | مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کی ایک نہایت اہم خصوصیت معلم اور داعی ریاست ہوتا ہے۔ اسلام نے انسان کی دنیا و آخرت دونوں کی فوز و فلاح کا رشتہ علم سے جوڑ دیا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ کوئی حکومت اس وقت تک کامیابی سے نہیں چل سکتی جب تک اس کے عوام وفادار، صالح اور فرمانبردار نہ ہوں۔ اور ان صفات کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی بات یقین کے درجے کو پہنچ چکی ہے کہ کسی حکومت کا کوئی نظام صرف اور صرف دعوت کے ذریعے ہی چل سکتا ہے۔ اسلام نے ان دونوں، تعلیم اور دعوت، کا حد درجہ اہتمام فرمایا ہے۔

قرآن و حدیث میں تعلیم کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں عوام کو تعلیم دینے کا انتظام فرمایا۔ مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے قریب کا "صفہ" اس پہ دلیل ناطق ہے۔ پھر خلفاء راشدینؓ اور بعد کے ادوار میں تعلیم و تعلم کا چرچا عام کیا گیا، حتیٰ کہ بعد کے ادوار میں دنیا کے گوشے گوشے سے طلبہ قرطبہ، قیروان، قاہرہ، بغداد وغیرہ میں تحصیل علم کیلئے آتے۔ یورپ جو آج اپنی علمی ترقیات پر نازاں ہے۔ اس کی جہالت کی تاریکی کو منور کرنے کے لئے برقی قمقمے اندلس سے آئے تھے، جن کی روشنی میں "تحریک احیاء علوم" نے رنگ پکڑا۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ کا مطالعہ کر جائیے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ تعلیم لازمی اور مفت تھی۔ ان تمام مضامین کی تدریس ہوتی تھی جن کا مطالعہ انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ رہا اسلامی ریاست کا بحیثیت "داعی" ہونے کا پہلو، تو سنئیے:۔ اسلام ایک عالمگیر اور تحریکی مذہب بن کر آیا۔ وہ یہودیت اور بدھمت کی طرح کسی خاص قوم یا خاص خطۂ ارض والوں کا مذہب نہیں ہے۔ امت مسلمہ کو دنیا بھر کے انسانوں کے لئے داعی بنا کر بھیجا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آل عمران : ۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی نفع رسانی کے لئے نکالے گئے ہو، تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس لئے اسلامی مملکت کا خلیفہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی رعایا میں اس دعوت اسلام پھیلائے بلکہ دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچائے۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خلفاء راشدینؓ اور بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مبلغین کی جماعتیں تیار کر کے بیرون ملک بھیجی جاتی تھیں۔ آج صرف مصر کو یہ شرف حاصل ہے۔ کہ اس کے مبلغین افریقہ میں تبلیغ کا حق ادا کرتے ہیں۔ (صدر ناصر مرحوم کے عہد میں ایسا تھا نہ جانے آجکل ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔)

اسلام تلوار سے نہیں دعوت سے پھیلا ہے اور مسلمانوں کو سربلندی اور سرفرازی کا دار اس ہی پر منحصر ہے۔ آج ہماری ذلت و مسکنت کی سب سے بڑی وجہ دعوت کے عمل کا چھوڑ دینا ہے

الغرض یہ ہے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کی نمایاں خصوصیات کا ایک مختصر جائزہ۔۔۔

آج جس تباہی کے دروازے پر پوری دنیا کھڑی ہے اس کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے اسلام اور صرف اسلام۔ اگر پاکستان میں صحیح اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور یہ دیگر اقوام عالم کے لئے نمونہ بنے۔ تاکہ دنیا کو پتہ چلے کہ اسلام کے نظام حکومت کی برکات اور خیرات کیا ہیں۔؟

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لاؤ کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

■■

افکار و تاثرات ——— قارئین

بروہی جیسے لوگوں کی اسلام پسندی | جو عربی زبان و ادب پر اس کے محاورہ اور اسلوب اور فصاحت و بلاغت کے اصول و نکات کے ساتھ پوری طرح عبور نہ رکھتا ہو اور جس نے تفسیر حدیث اور فقہ کی امہات الکتب معتبر اساتذہ سے باقاعدہ نہ پڑھی ہوں۔ وہ اسلام پر، اسلامی نظریۂ حیات پر (یہ بھی اسلامی علوم کے جاہلوں کی ایجاد ہے افسوس ہے کہ یہ سراسر بیرونی غیر اسلامی اصطلاح آئیڈیالوجی علماء کی زبان سے بھی سننے میں آتی ہے۔) اور بالخصوص اسلامی قانون پر بولنے کا حق نہیں رکھتا۔ پاکستان میں اسلام کی خیر اسی میں ہے کہ اس اصول پر سختی سے اصرار کیا جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی علوم کا جاہل جدید تعلیم یافتہ (یکے از "زائران حریم مغرب") ماہر تعلیم یا ماہر قانون اسلام کی منقبت بیان کرتا ہے تو علماء اُسے "تحسین ناشناس" قرار دینے کی بجائے اس کے تعاون کے طالب ہو جاتے ہیں۔ جب اسلامی علوم کے جاہل کو یہ درجہ مل جائے کہ علماء اس کے تعاون کے طالب ہوں تو وہ بے ظرف یا کم ظرف، جلد یا بدیر دنیاوی حشمت و ثروت کا سہارا لے کر علوم عربیہ اسلامیہ کی تحقیر کرتا ہے۔ اور علماء کو بے دخل کر کے خود اسلام کا دعویدار بنتا ہے۔ اگر بروہی صاحب کا اصلی روپ آج دکھائی دیا ہے۔ تو علماء کی سادگی اور تواضع نے ان کو یہ جرأت دلائی ہے۔ اس قماش کے لوگوں کا شروع ہی سے جب وہ اسلام کی ثنا خوانی شروع کرتے ہیں۔ (اور علماء اس سے خوش ہوتے ہیں) مقصد یہی ہوتا ہے کہ علوم عربیہ اسلامیہ کی ضرورت سے انکار کریں اور ان کے مقابلہ میں علوم عصریہ کی فوقیت جتائیں۔ من جہل شیئا عاداہ۔ ایسے لوگوں سے تعاون کی توقع ہی عبث ہے ———

شریعت کے مسائل میں علوم عربیہ اسلامیہ کے جاہلوں کے تعاون کے کیا معنی؟ زیادہ سے زیادہ علماء شرعی قانون کی تدوین میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب سے ویسا ہی کام لے سکتے ہیں، جیسا کہ ایک انجنیئر جاہل معماروں سے لیتا ہے، ایک ڈاکٹر نرسوں سے لیتا ہے، ایک طبیب عطار سے لیتا ہے۔

اس سے بہتر مثال یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں مجالس قانون ساز قانون پر بحث کرتی اور اسکی منظوری دیتی ہیں۔ قانون کی تدوین کا کام حکومت کی وزارت قانون میں انجام پاتا ہے۔ وزارت قانون میں کیسے ہی ماہر ہوں انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ مجالس قانون ساز کے ممبروں کو نااہل قرار دے کر خود قانون سازی کا منصب سنبھال لیں۔ قانون سازی عوام کے منتخب نمائندوں کا حق ہے جو عوام کی مصلحت ونقصان کو سمجھتے ہیں۔ وزارت قانون کی حیثیت ایک درزی کی ہوتی ہے جو آرڈر کے مطابق کپڑے سیتا ہے۔ اگر کسی گستاخ درزی کو سر چڑھایا جائے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ پائجامہ کی بجائے پتلون سی کر رکھ دے گا۔ اور کہے گا کہ آپ کو دنیا کی خبر نہیں، آج کا فیشن یہی ہے۔ بس فلاں پائجامہ کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق بنا دیا ہے۔

ایسے ہی ایوب خاں نے ایک عربی اسلامی علوم کے جاہل معاند کو اسلام کا پرمٹ اور اسلامی ریسرچ کا ٹھیکہ دیا۔ اسلامی ریسرچ کا ٹھیکہ تو زیادہ دن نہ چل سکا، لیکن اسلام کا پرمٹ برقرار رہا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ اسلامی ریسرچ کا عربی اسلامی علوم سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ ان کی بجائے اسلامی نظریہ حیات کو رواج دیا اور ایک عربی سے معریٰ اسلامیات ایجاد کی۔ سیاسی حکمت عملی دیکھیے کہ ایک مفتی کے کاندھے پہ بندوق رکھ کر عربی اسلامی علوم کو نشانہ بنایا گیا اور ایک مفتی سے عربی اسلامی علوم کی قبر پہ فاتحہ پڑھوایا گیا۔ آگے چل کر انہوں نے یہ زہر اگلا کہ اگر عربی فارسی ترکی تینوں زبانوں کے اسلامی لٹریچر کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور صرف اردو کے اسلامی لٹریچر کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے۔ تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔ یہ جہل نہ تھا، بلکہ عربی اسلامی علوم کو غیر ضروری قرار دینے کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ ایک طرف یہ سازش تھی اور دوسری طرف وہی اسلام کی "تحسین ناشناس" جس سے علماء خوش ہوتے رہے اور سازش کامیاب ہوتی رہی۔

عربی اسلامی علوم کے جاہلوں کو "اسلامی شخصیت" کا خطاب دینے کا کاروبار کھلم کھلا اور بڑے پیمانہ پہ جماعت اسلامی کرتی رہی ہے۔ افسوس کہ اس جماعت نے عربی اسلامی علوم کے احیاء اور فروغ کے لئے ذرہ برابر کچھ نہ کیا اور بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ تاثر دیا کہ امیر جماعت کی اردو نگارشات تمام عربی اسلامی علوم سے مستغنی کر دیتی ہیں اور ان پر گزارہ کرنے والا پوری ڈھٹائی کیساتھ اسلام کی اجارہ داری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ خوب ہوا کہ تفہیم القرآن کے ختم کے موقع پر انہی عربی اسلامی علوم کے جاہلوں نے مل کر تقریظ تبریک کی رسم ادا کی۔

دوسری طرف وہ نام نہاد علماء ہیں جو بڑی بڑی دستاریں باندھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی کبھی دستار بندی

نہیں ہوتی۔ محض علماء کی شکل و صورت بیچ میچ بنانے سے کوئی کوئی عالم نہیں ہو جاتا۔ پھر یہ تو ضلّوا واضلّوا کا مصداق صریحاً بدعتی ہیں کسی وقتی سیاسی محاذ آرائی کی خاطر انہیں علماء کہنا دین کے لئے خطرہ ہے۔ گذشتہ انتخابات کے دوران بے محل فتووں کی جو مہم چلائی گئی اور نااہل اور غیر ثقہ لوگوں کو علماء کی فہرست میں شامل ہونے کا موقع دیا گیا اس سے علماء کے وقار کو اور خود دین کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ یہ امانت اور فراست دونوں کے خلاف ہے کہ جہل اور بدعت کو علماء کا ایک مکتب خیال کہا جائے!

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(ڈاکٹر محمد یوسف پروفیسر عربی جامعہ کراچی)

قادیانیت، علامہ اقبالؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ آپ کا اداریہ ماشاء اللہ انتہائی بلیغ، وقیع اور موثر ہے۔ مرزائیت کا خوب خوب نوٹس لیا گیا ہے، ماشاء اللہ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ جناب علامہ اقبالؒ نے تحریک کشمیر کے آغاز ہی میں (حسب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند کے ایماء پر حضرت العلام السیّد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے انہیں حقائق سے سرفراز فرمایا تھا۔) ردّ قادیانیت کا مقدس مشن شروع کر دیا تھا۔ اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات واشگاف طور پر ظاہر و باہر ہو جائے گی کہ حضرت علامہ خیالؒ کے جتنے بھی اسلامی مقالات ہیں ان میں کثرت ان مقالات کی ہے جو انہوں نے حضرت ختمیّت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت شرعیہ اور ان کی خاتمیت پر قلمبند فرمائے ہیں۔ اور یہ سب فیضان حضرت انور شاہ کشمیریؒ کا ہے جو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور ان کے ساتھیوں کے توسط سے جناب علامہ پر ہوا۔ میں اسکی تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ہماری نئی پود گذشتہ حقائق یعنی تاریخ اسلامیہ کے ایک سنہری باب کے اس بنیادی حصہ سے بخوبی آگاہ ہو سکے۔

غالباً ۱۹۲۸ء۔۱۹۲۹ء میں مظلوم مسلمانان کشمیر کی داد و دہش اور حق رسّی کے پیش نظر ایک کمیٹی تشکیل کی گئی تھی جس کا نام "کشمیر کمیٹی" رکھا گیا تھا۔ اس کمیٹی کا اوّلین مقصد کشمیر کے راجہ ہری سنگھ کی مسلمانان کشمیر کے خلاف سرگرمیوں کا محاسبہ کرنا اور ہر قیمت پر اس ظلم و تشدد کا خاتمہ کرنا تھا جس نے ریاست مذکورہ کے مسلمانوں کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے علاوہ دیگر کئی قومی زعماء اس میں شریک تھے

گورنمنٹ برطانیہ نے اپنی دیرینہ چوہا چال کے تحت مرزا ئے محمود کو جسکا دادا مرزا غلام مرتضیٰ ساکن قادیان مغلاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو اس وقت کے جیّد علمائے حق اور مجاہدین

آزادی کے خلاف اپنی جاسوسی اور مخبری کی خدمات رذیلہ پیش کر چکا تھا اور کہ جس کا باپ غلام احمد قادیانی انگریزوں کے تیار کردہ منصوبہ کے تحت مسلمانانِ عالم کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے ادّعائے نبوّت کر کے بزعم خود نسلِ افرنگ پر ایک ایسا احسانِ عظیم کر گیا ہے، جسے اسکی نسل خداوندانِ افرنگ کی اطاعتِ دوامیہ کے لئے ہمیشہ ہمیشہ جاری و ساری رکھنے کا ابلیسی عہد کئے ہوئے ہے۔ ایسا مہرشدہ اور سکّہ بند مہرہ ہونیکی حیثیت سے اس کمیٹی میں داخل کر دیا جو پھر اپنی ریشہ دوانیوں سے صدارت کے عہدہ تک جا پہنچا۔

ان حقائق کے پیش نظر بھلا انگریز بہادر کو اپنے آزمودہ کار باپ دادا کے بیٹے اور پوتے سے (جس کی مزید ٹریننگ بھی برٹش سرکار کے ملبی دعاوی کرتے رہتے ہوں۔) بڑھ کر کوئی اور کیا کام دے سکتا تھا جس شخص کے وجود کا تصور ہی، ابلیسیّت، ارتداد، کفر اور اسلام دشمنی بل بغاوت بالنبوّت سے عبارت ہو وہی تو تلبیسی چالوں سے کما حقّہٗ عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ کسی اور کی کیا مجال۔

غضب خدا کا کہ علامہ اقبالؒ جیسا شخص بھی اس کے ابلیسی تقدّس کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا[1]۔

اس بات کا علم جب زعمائے احرار حضرت السیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا مظہر علی اظہر اور الشیخ حسام الدینؒ کو ہوا تو وہ ششدر ہو کر رہ گئے۔ تحریکِ کشمیر اسوقت اپنے پر تول رہی تھی، یہ حضرات اسوقت اپنا دن اور رات ایک کئے ہوئے تھے۔ تاہم ان حضراتِ گرامی نے اس المیہ کی اطلاع فوراً حضرت السید انور شاہ کشمیریؒ کو دی۔ کیونکہ حضرات انور شاہ صاحب کشمیری تھے۔ اور زعیم عظیم ملّت بھی اس لئے وہ تحریکِ کشمیر اور علامہ اقبال دونوں سے خاطر خواہ طور پر متعلق تھے، علامہ انور شاہ صاحبؒ کو جب یہ خبر پہنچی تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ اوّلین فرصت میں

---

[1] مگر بحمد للہ کہ علامہ اقبالؒ پر جلد ہی حقیقت ظاہر ہو گئی اور یہ تعلق بیزاری سے اور بالآخر نفرت اور بغاوت سے بدل گیا۔ خود تحریر فرماتے ہیں: "مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی ...... معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوّت۔ بانیٔ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویّہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول "ایمرسن" "صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔" (حرفِ اقبال ص ۱۳۱، ۱۳۲)

ادارہ

علامہ اقبالؒ سے روبرو گفتگو فرمائی، علامہ اقبالؒ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا سراپا ہی بدل گیا، فوراً اپنے خیالات سے رجوع فرمایا اور پھر ہمیشہ کے لئے انگریزیت و مرزائیت کے مقابلہ میں بہر لحاظ سینہ سپر ہو گئے۔ انہی تاثرات کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے جواب میں اپنے اینٹی مرزائیت خیالات کا پوری تفصیل سے جائزہ لیا تھا۔ علاوہ ازیں ان کے کلام میں بھی ان قلندرانہ ضربوں کی کمی نہیں جو انہوں نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں مرزائیت کے وجود مردود پر تکرار رسید کی ہیں۔

یہ ہیں وہ صحیح حقائق جنکی بنا پر کشمیر کمیٹی کی زمام کار حضرت السید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا مظہر علی اظہر چوہدری افضل حقؒ، الشیخ حسام الدینؒ اور ماسٹر تاج الدین انصاریؒ نیز علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے ہاتھوں میں آگئی، جس سے "کشمیر چلو" کی صداؤں سے ہندوستان گونج اٹھا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے کہ انگریز سامراج کے خلاف ایک کوہ آتش فشاں کی حیثیت رکھتے تھے۔ قافلہ سالار اول کی صورت میں کشمیر کی سرزمین پر جب قدم رکھا تو ہری سنگھ مہاراجہ کشمیر بوکھلا کے رہ گیا۔ انگریز بہادر کے دروازے پر گڑگڑایا، انگریز بہادر نے بیچ بچاؤ کا رول ادا کیا۔

مجلس احرار اسلام ہند کی طرف سے، ابوحنیفۂ وقت حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیت العلمائے ہند اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ دہلوی ناظم جمعیۃ العلماء ہند اور انگریز بہادر کیطرف سے ہری کشن کول وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر اور مہاراجہ ہری سنگھ والئے کشمیر کی صورت میں ایک مصالحتی کمیٹی تشکیل ہوئی، سہرا احرار زعماء کے سر رہا۔ اور مسلمانان کشمیر سرفرازی کے ساتھ من حیث القوم تسلیم ہوئے۔

یہ تھی سب سے پہلی تحریک جو ریاست جموں و کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کیطرف سے چلائی گئی اور جس کے محرکین اور بانی حضرات زعمائے مجلس احرار تھے۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج جب یوم شہدائے کشمیر منایا جاتا ہے تو ان مرحومین کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا جاتا ہے۔ جو اس کے اہل کرتا دھرتا تھے۔

والسلام۔ (محمد اقبال کاشغری۔)

اسرائیل اور مرزائیل قادیانی اس ملک میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عرب میں اسرائیل۔ اور پاکستان میں مرزائیل، یہ اسلامی سلطنتوں کو تہہ و بالا کرنے کے غیر ملکی اڈے ہیں۔ ان کے خلاف آپ کا شبانہ روز قلمی جہاد قابل تحسین ہے۔ آپ امت مسلمہ کی طرف سے ایک عظیم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ خدا آپکا حامی و ناصر ہو۔ (اللہ وسایا مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت لائل پور)

مولانا عبد الشکور صاحب ایم۔اے فاضل دیوبند

حافظ قاری فیوض الرحمٰن ایم۔اے
پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد

پیدائش و ابتدائی تعلیم | آپ ۱۸ر جولائی ۱۹۱۸ء میں "کھلابٹ" تحصیل ہری پور کے مقام پہ پیدا ہوئے۔ مقامی سکول سے پرائمری پاس کرکے ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا سید احمدؒ کے پاس ریاست رامپور چلے گئے۔ نحو کی کتب مولانا موصوف سے پڑھیں، شرح جامی، کنز الدقائق، نور الانوار اور مختصر المعانی تک کی کتابیں "مطلع العلوم" ہی میں پڑھیں۔ ۱۹۳۵ء تک اسی مدرسہ میں قیام رہا۔ ۱۹۳۶ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور مقامات حریری، ملا حسن، شرح وقایہ، میر زاہد اور تفسیر جلالین اسی مدرسہ میں پڑھیں۔

۱۹۳۷ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ بخاری و ترمذی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے طحاوی حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب دامت برکاتہم سے، ابو داؤد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے اور صحیح مسلم حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ سے پڑھیں۔ کتب حدیث کے علاوہ ادب کے امام حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے حماسہ، متنبی، ہدایہ آخرین اور شمائل ترمذی پڑھیں۔ اور مولانا عبد السمیع صاحبؒ سے "مشکوٰۃ" اور بیضاوی شریف پڑھیں۔

فراغت و تدریس | ۱۹۴۰ء میں فراغت ہوئی۔ فراغت کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور ۱۹۴۲ء میں ہری پور کے ممتاز تعلیمی ادارہ ـــ "احمد المدارس" میں درس نظامی کی تدریس شروع کی۔ اور ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی عرصۂ قیام کے دوران ۱۹۴۲ء میں آپ نے پنجاب

باقی صـ ۹۵ پہ

تبصرۂ کتب

جناب اختر راہی۔ ایم اے

افکارِ ذاکر (ملفوظات حکیم سید ذاکر حسین) مرتب: امان علی نقوی۔ **صفحات**: ۲۰۴
ناشر: شعبۂ تصنیف و تالیف ابن سینا ہسپتال کراچی۔ **طباعت**: عمدہ۔ ٹائٹل: جاذبِ نظر
قیمت چار روپے۔

حکیم سید ذاکر حسین حکومت پاکستان کے قائم کردہ طبی ریسرچ سنٹر کے نگران رہے ہیں۔ اور طبِ یونانی کی ترویج و احیاء کے لئے ابن سینا ہسپتال قائم کئے ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب کی شہرت دور دور پھیل چکی ہے۔ تبدیلیٔ قلب کے شہرۂ آفاق ڈاکٹر برنارڈ بھی ان کی صائب رائے تسلیم کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حکیم صاحب کے ان طبی ملفوظات پر مشتمل ہے۔ جو امان علی نقوی نے قلمبند کئے ہیں۔ حکیم صاحب ایلوپیتھی (جدید مغربی طریق علاج) سے قطعاً مرعوب نہیں۔ انہوں نے طب یونانی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ مرچ کا استعمال نہایت نقصان دہ ہے۔ کراچی کے بعض ڈاکٹر اور طبیب اسی رائے پر زور دیتے رہے۔ مگر حکیم صاحب نے بتایا کہ کراچی جیسے مرطوب آب و ہوا کے شہر میں مرچ اور گرم مصالحوں کا مناسب استعمال صحت کے لئے مفید ہے۔ حکیم صاحب نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے کہ موجودہ ڈاکٹری سرجری میں طب یونانی سے کوسوں آگے ہے۔ اور اسے اپنانا ضروری ہے۔

کتاب کے ابتدائی اٹھ صفحات میں حکیم صاحب کی زندگی اور عادات و اطوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرتب نے طب سے ان کی والہانہ محبت اور طبی خدمات کا حسین تذکرہ کیا ہے۔ دو سو صفحے کی اس کتاب میں امراض قلب، ذیابیطس، گردن توڑ بخار، یرقان، پیچش اور کئی دوسری بیماریوں پر حکیم صاحب کے تجربات کا ماحصل موجود ہے۔ مختصر یہ کہ کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ یونانی اطباء کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہی نہیں ضروری ہے۔ عام قاری بھی خاطر خواہ استفادہ کرسکتے ہیں۔

❊ ❊ ❊